غالب نمبر

کاروان

گورنمنٹ کالج ، جھنگ

کاروان

(۷۰-۱۹۶۹ء)

غالب نمبر

سرپرست

پروفیسر ایم - اے سعید
(پرنسپل)

ترتیب

محمد حیات خان سیال

معاونین

محمد اسلم ایم - اے

★ باقر علی سحر ★ انیس انصاری

★ زاہد کاشمیری ★ جاوید قریشی

گورنمنٹ کالج ، جھنگ

ناشر
محمد حیات خاں سیال
برائے
پرنسپل گورنمنٹ کالج ، جھنگ

★

طابع
ایس - ایم - شفیق
مطبع
شفیق پریس
۲۵ - کبیر سٹریٹ ، لاہور

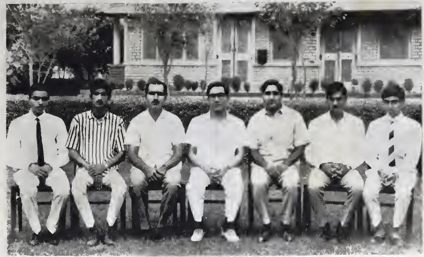

M. Anis Ansari, Assist. Editor Urdu Sec. — Syed Baqir Ali Sahar, Editor Urdu Section — M. Hayat Khan Sial, I/C Urdu Section — Prof M.A Saeed, Principal — Muhammad Aslam, I/C English Section

Zahid Kashmrii, Editor English Section — Javed Qureshi, Assist. Editor English Section

قفس رنگ

نقش فریادی	ادارہ	ﮦ
پیغام	ایم اے سعید (پرنسپل)	ز
غالب کا خط پرنسپل کے نام	محمد حیات خان سیال	ح
ہے عشر خیال کہ غالب کہیں جسے		
غالب کی کہانی (اس کی اپنی زبانی)	محمد حیات خان سیال	۳
تصانیف	جاوید ہاشمی	۱۰
غالب کے ذہن و مزاج کا تجزیہ	محمود احمد سحر	۱۱
غالب (ایک حقیقت نگار شاعر)	ڈاکٹر سخی احمد ہاشمی	۲۴
غالب نقاد فن	سید قدرت نقوی	۳۳
غالب مغلوب	پروفیسر محمد منور	۴۳
فکر غالب کے روحانی عناصر	سمیع اللہ قریشی	۵۵
فکر و فن کا بے مثال امتزاج ۔ غالب	احمد ندیم قاسمی	۶۴
مرزا غالب کے مقطعے	پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق	۶۸
غالب اور بیدل	شمیم عزیز	۸۶
غالب کا مزاج	رانا محمد سرور	۹۰
غالب بحیثیت غزل گو	ریحانہ خاتون شمع	۹۹
خطوط غالب میں ڈرامائی عناصر	عبدالباری عباسی	۱۱۳
غالب (رجائی تھے یا قنوطی)	افتخار احمد انصاری	۱۲۰
غالب کی جدت پسندی	غلام احمد بشر	۱۲۵
غالب اور ان کی شاعری	ایس ایس بھٹی	۱۲۹
غالب کی مشکل پسندی	باقر علی سحر	۱۳۴
غالب کوچہ یار میں	محمد انیس انصاری	۱۳۸
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک	ایم اسلم کوثر	۱۴۳
غالب کی شخصیت اور فن	ظفر حسین	۱۴۶
غالب (فارسی سے اردو تک)	محمد گلزار احمد	۱۵۴
غالب کی غزل	ممتاز	۱۵۸

غالب کی فارسی شاعری	شگفتہ بشیر	۱۶۳
دیوان غالب کا پہلا شعر	غلام شبیر سیال	۱۶۶
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو		
غالب کے نام خط	عارفہ انجم ، سلمیٰ شریف ، بشریٰ عنبر ، نسیم نقوی ، فاروق احمد فاروق ، منیر حسین شاہ ، عارفہ قریشی	۱۷۳
پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے		
غالب میری نظر میں	زہرہ پروین ، اجمل حسین چوہدری ، رضیہ تبسم گل ، محمد اشرف عاصی، عارف محمود ، منیر حسین شاہ	۱۸۵
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے		
انتخاب کلام اردو و فارسی	محمد حیات خاں سیال ، خان محمد گلزار ، محمد نواز خان بلوچ ، نصرت کمیانہ	۱۹۷
آج غالب غزل سرا نہ ہوا		
غالب کی زمین میں غزلیں	کالج کے طلبا ، سابق طلبا ، مقامی شعرا	۲۲۳
موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی		
غالب کی شوخیاں	جاوید ہاشمی	۲۴۳
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا	طفیل شیخ	۲۴۷
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد	فیاض قریشی	۲۴۹
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے		۲۵۱
غالب کا انٹرویو	م - ج - خ -	۲۵۷
اندیشہ ہائے دور دراز	زاہد کاشمیری	۲۶۳

نقش فریادی

کاروان کا **غالب نمبر** پیش خدمت ہے ۔ اگر آپ اس کی اشاعت میں تاخیر پر اعتراض کریں تو ہم غالب کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا

ادارہ کاروان کے زیر اہتمام ۱۹۶۸ء میں غالب انعامی مقابلہ منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل عنوان دے گئے تھے :

۱ ۔ غالب میری نظر میں
۲ ۔ غالب کے نام خط غالب کے انداز میں
۳ ۔ طرحی غزل

مصرع طرح ۱ ۔ آج غالب غزل سرا نہ ہوا
۲ ۔ مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے

طرحی غزل کے لیے کالج کے دیرینہ طلبا کو بھی دعوت دی گئی ۔

اس مقابلے میں متعدد کالجوں کے طلبا اور طالبات نے حصہ لیا ۔ منتخب تحریریں اس شمارے میں شامل کی جا رہی ہیں ۔ ادارہ کاروان نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ مرزا غالب کی یاد میں ایک خصوصی شمارہ شائع کیا جائے جس میں کالج کے اساتذہ ، طلبا کے علاوہ ملک کے نامور لکھنے والوں سے بھی مقالات حاصل کیے جائیں ۔ چنانچہ، کام شروع کر دیا گیا ۔ ہمیں خوشی ہے کہ تمام نقادوں نے ہمارے ساتھ تعاون کا یقین دلایا لیکن بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر یہ کام معرض التوا میں پڑ گیا ۔ اس لیے بعض اصحاب کو مقالات واپس بھیجنا پڑے بعض کو یاد دہانی نہیں کرائی گئی ۔ مشکل یہ تھی کہ میگزین فنڈ کے پیش نظر کاروان کو نقوش بنانا ہمارے بس میں نہ تھا ۔ لیکن جب تقاضے شروع ہوئے تو پھر ارادہ بدلنا پڑا اور کچھ مواد پریس میں بھیج دیا گیا اور اس طرح یہ خصوصی شمارہ تیار ہو گیا ۔ اس کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے ۔ قارئین بہتر رائے قائم کر سکیں گے ۔ بہر حال اس کالج کی تاریخ میں یہ نئی روایت ہے کہ کسی ایک شخصیت پر خصوصی شمارہ شائع کیا جا رہا ہے ۔

غالب نمبر کا مواد جمع کرنے میں سابقہ مدیر ارشاد گرامی اور نور احمد ثاقب کا بھی حصہ ہے۔ ڈاکٹر اے ڈی نسیم ، پروفیسر سلیم اختر ، ڈاکٹر خان رشید ، ڈاکٹر عبدالقیوم اور متعدد دیگر حضرات سے معذرت خواہ ہیں جن کے مقالات کاروان کی اشاعت میں تاخیر کی وجہ سے لوٹانا پڑے۔ ہم ڈاکٹر انعام الحق کوثر ، سید قدرت نقوی ، محمود احمد سحر ، پروفیسر محمد منور ، ندیم قاسمی ، ڈاکٹر سخی احمد ہاشمی کے خاص طور پر شکر گزار ہیں جن کے مقالات اس شمارے کی زینت ہیں۔ ہم مقامی شعرا اور کالج کے دیرینہ طلبا سید جعفر طاہر ، شیر افضل جعفری ، ڈاکٹر وزیر آغا ، رفعت سلطان ، محمود شام ، افضل حسین اظہر ، بیدل پانی پتی ، اصغر شاہیہ ، قدیر قیس ، صفدر سلیم ، انیس شیرازی کے بھی ممنون ہیں جنھوں نے اپنی تصنیفات عطا فرمائیں۔

بزم ادب کے زیر اہتمام دو دفعہ یوم غالب منایا گیا۔ جناب محمد منور (گورنمنٹ کالج لاہور) کا مقالہ اسی تقریب میں پڑھا گیا تھا۔ اس خصوصی شمارے کی ترتیب میں پروفیسر سمیع اللہ قریشی اور عبدالباسط نے مفید مشورے دیے ادارہ ان کا تہ دل سے ممنون ہے۔ آخر میں ہمیں اپنے مشفق پرنسپل کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کی خصوصی توجہ سے یہ رسالہ آپ کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے۔

پیغام

مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ ادارہ کاروان مرزا غالب کی یاد میں ایک خصوصی شمارہ شائع کر رہا ہے ۔

مرزا غالب ہماری تہذیب و ادب کے بہترین نمائندے ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ اردو کے عظیم شاعر ہیں تو بے جا نہ ہو گا ۔ ان کا مختصر دیوان حقائق زندگی کا ایک حسین مرقع ہے جس میں ہر انسان اپنے دل کی دھڑکنوں کو سن سکتا ہے ۔ ان کے اشعار انسان دوستی ، محبت اور وسیع المشربی کے ابدی نغمے ہیں ۔

غالب بہت ذہین اور حساس انسان تھے اور انہی خوبیوں نے انہیں ایک عظیم شاعر بنا دیا ۔ ان کی شاعری ہمیں پیغام دیتی ہے کہ زندگی اپنی خامیوں کے باوجود خوبصورت اور قابل قدر ہے ۔ انہوں نے طبعی شگفتگی سے زندگی کی زہرناکیوں کو مسکراہٹوں میں بدلا اور اپنی تحریروں میں بھی وہ کیفیت بھر دی جو ان کی طرح ان کے قاری کو بھی دکھوں میں مسکرانا سکھاتی ہے ۔

نئی نسل خصوصاً نوجوانوں کو کلام غالب سے کماحقہ استفادہ کرنا چاہیے ۔ میں ادارہ کاروان کو اس پیشکش پر مبارکباد پیش کرتا ہوں ۔

محمد عبدالسعید
(پرنسپل)

محمد حیات خاں سیال

غالب کا خط پرنسپل گورنمنٹ کالج جھنگ کے نام

نور چشم راحت جاں جیتے رہو اور خوش رہو - سبحان اللہ آپ کے خط کا جواب نہ لکھوں ، اپنے کو نفرین کروں ، اگر شتاب نہ لکھوں - اس وقت ڈاک کے ہرکارے نے تمہارا خط دیا - ادھر پڑھا ادھر جواب لکھنے کا قصد کیا - میں ایک شخص گوشہ نشیں فلک زدہ و اندوہ گیں مجھ سے نکمے آدمی کا جو کوئی مشتاق ہو تو اس کے خط کا جواب لکھنا کیوں شاق ہو - ظاہرا تم خود مجمع حسن اخلاق ہو ورنہ کیوں تم کو اس قدر اشتیاق ہو -

لو اب میری کہانی سنو اور میری زبانی سنو - بہشت میں اقامت جاودانی ہے اور اسی ستم پیشہ کے ساتھ زندگانی ہے البتہ داغ حسرت دل کا شمار یاد آتا ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے - کبھی رضوان سے لڑائی کبھی حوروں کی دہائی - نہ دن کو چین نہ رات کو آرام اور یہ شاعر بدنام - غلام ساقی کوثر تھا باز برس نہیں ہوئی ورنہ میں کیا میرے اعمال کیا - پینے کو یہاں بھی مل جاتی ہے لیکن پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں -

ہاں دعوت نامہ انجمن طلبا کا مل گیا تھا لیکن یہ طرح دار گلیاں چھوڑ کر کون جائے خصوصاً آج کل جب کہ جھنگ کرہ نار ہو - انچارج انجمن کو یہ پیغام پہنچا دینا -

فرصت کاروبار شوق کسے
ذوق نظارہ جمال کہاں

البتہ انٹرویو کے لیے ضرور حاضر ہوں گا - سمیع اللہ قریشی کا مضمون حالی نے پڑھ کر سنایا ، لطف آیا ، اگر اسلوب میں سادگی ہوتی تو اور بھی خوشی ہوتی - حاجی عبدالرحمن کو دعا دینا اور کہنا ، میاں کس قصے میں پھنسا ہے - فقہ پڑھ کر کیا کرے گا - طب ، نجوم ، فلسفہ پڑھ - خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام یہی ہے

مذہب حق والسلام والاکرام -

آپ کے شعبہ ریاضی کے دونوں استادوں کے لیے سہرا گذشتہ بیس سال سے لکھ رکھا ہے ، جب حکم ہوگا پیش کر دوں گا - میں نے یہاں چناب ڈرامیٹک کلب کی ایک شاخ کھول لی ہے اور تاج صاحب کو نگران مقرر کیا ہے - برخوردار خلیل اور نور چشمی عباسی کو کہنا ساز و سامان لے کر پہنچ جائیں مگر میک اپ کی تمام اشیا ساتھ لائیں - بلانا ذرا جہانگیر کو - کیوں میاں - اکیلے ہی ہوسٹل میں مرغے اڑاتے ہو اور ہمیں دال بھجواتے ہو -

حال یہاں کی سیاست کا پوچھ کر کیا کرو گے - کچھ عرصے سے جلسے جلوسوں کا شور ہے گھیراؤ پر پورا زور ہے - لیڈروں کو شوق ہے تقریر کا اور کچھ ڈر نہیں تعزیر کا - نو وارد ایک نئے مرض کے جراثیم لائے ہیں چنانچہ ہم نے اینٹی سوشلزم کے ٹیکے کرائے ہیں - چند دنوں کی بات ہے شاہد خدا کی ذات ہے میں نسخۂ حمیدیہ بغل میں دبائے ذرا مال روڈ پر چہل قدمی کر رہا تھا کہ دو سکوٹر// آئے اور دیوان چھین کر چلتے بنے - رہزنوں کو دعا دی - مگر معلوم ہے کیا غضب کیا ، میرے اشعار نکالے اور کئی کتبے بنا ڈالے - احتجاجی جلوس کا ہنگامہ برپا ہوا - آگے آگے مزدوروں کا گروہ تھا جنھوں نے کتبوں پر لکھ رکھا تھا -

رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

ان کے پیچھے کچھ سفید پوش بزرگ تھے جو چلا چلا کر کہہ رہے تھے -

مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

زیر لب یہ آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں

آدمی کوئی دم تحریر بھی تھا

ادیب اور شاعر اپنی تخلیقات اٹھائے کانوں پر قلم رکھے شور مچا رہے تھے

انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

طلبا ”بیا قاعدہ آسماں بگردانیم“ کا نعرہ لگاتے تھے اور باغ بہشت سے پھل بھی توڑ توڑ کر کھاتے جاتے تھے - سب سے آخر میں پروفیسروں کا جلوس تھا جن کے ہاتھ میں یہ پلے کارڈ تھے -

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

محتسب نے رپورٹ دی کہ یہ سب کتبے میں نے بنوا کر دیے ہیں - غرض مخبروں نے میرا نام لکھوایا اور گرفتار کرایا - شکر ہے ہمارے علاقے کے قاضی وہی مفتی

آزردہ ہیں ورنہ سزا پاتا اور تمام عمر جیل میں گنواتا ۔ اگر کسی بیرسٹر دوست کو مقدمہ کی پیروی کے لیے سفارش کر دیں تو تا عمر دعا دوں گا ۔ رہی فیس کی بات تو قرض سہی ۔

میں کیا میرا پیغام کیا ۔ از رہ امتثال امر طلبا کے لیے یہ شعر بھیج رہا ہوں

ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

میٹھے آموں کی دو چار ٹوکریاں بھجوا دو تو کیا گناہ ہو ۔ مہدی مجروح اس وقت میرے پاؤں داب رہے ہیں اور سلام لکھواتے ہیں ۔ خط کا جواب جلدی دینا مگر بیرنگ نہ ہو ۔ کاغذ نبڑ گیا ورنہ تمہاری خوشنودی کے لیے کچھ اور لکھتا ۔

دعا کا طالب

از جی پی او اعراف رواں داشتہ　　　　(غالب)

ہے محشر خیال کہ غالب کہیں جسے

محمد حیات خاں سیال

غالب کی کہانی

(اس کی اپنی زبانی)

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے　　کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

خاندان

میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں ۔ دادا میرا ماوراءالنہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان میں آیا سلطنت ضعیف ہو چکی تھی ۔ صرف پچاس گھوڑے نقارہ نشان شاہ عالم کا نوکر ہوا ۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالہ کی تنخواہ میں پایا بعد انتقال اس کے جو طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم تھا وہ علاقہ نہ رہا ۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خاں لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر ہوا ۔ پھر حیدرآباد میں نواب نظام علی خاں کا ملازم ہوا ۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے جھگڑے میں جاتی رہی والد سے گھبرا کر الور کا رخ کیا ۔ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا ۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا ۔

غالب از خاک پاک تورانیم　　لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی　　بسترگان قوم پیوندیم

نصراللہ بیگ خاں میرا چچا حقیقی مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا ۔

پیدائش

عالم دو ہیں ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل ۔ قاعدہ عام یہ ہے کہ آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں چنانچہ آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ (۲۷ دسمبر ۱۷۹۷) میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا ۔

ہم ''شورش شوق'' آمدہ و ہم لفظ ''غریب''
تاریخ ولادت من از عالم قدس

نام

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس　　ہم اسداللہم و اسد اللہیم

نام اسد اللہ خاں غالب تخلص عرف مرزا نوشہ۔

ایک صاحب نے میرے سامنے یہ مطلع پڑھا :

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی — میرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے عرض کیا کہ صاحب ! جس بزرگ کا یہ مطلع ہے اس پر بقول اس کے رحمت خدا کی اور اگر میرا ہو تو مجھ پر لعنت ۔ اسد اور شیر ، بت اور خدا میری طرز گفتار نہیں ۔ بات یہ ہے کہ ایک شخص میر امانی اسد ہو گزرے ہیں اور یہ غزل اس کے معجز نظام میں سے ہے اور تذکروں ہیں مرقوم ہے ۔ میں نے تو کوئی دو چار برس اسد تخلص رکھا ورنہ غالب ہی رکھتا رہا ہوں ۔

لڑکپن

میرا حقیقی بھائی ایک تھا وہ تین برس زندہ رہ کر مر گیا ۔ میرے چچا نصراللہ بیگ خاں نے مجھے پالا ۔ پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا ۔ آٹھ برس کا تھا جو چچا مر گیا ۔

تعلیم

میں نے ایام دبستان نشینی میں شرح ماتہ عامل تک پڑھا اور اس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور عیش و عشرت میں مبتلا ہو گیا ۔ میری فطرت کو زبان فارسی سے لگاؤ تھا ۔ مارے مراد بر آئی اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا اور اکبر آباد (آگرہ) فقیر کے مکان پر دو برس رہا اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبان فارسی کے معلوم کیے ۔

مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے چونکہ مجھ کو لوگ بے استاد کہتے تھے ۔ ان کا منہ بند کرنے کو ایک فرضی استاد گھڑ لیا ہے ۔

حلیہ

میرا قد درازی میں انگشت نما ہے ۔ جب میں چلتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے ۔ اب جب کبھی مجھ کو وہ رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے ۔ چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے ۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی ، مگر یاد رکھئے اس بھونڈے شہر میں ایک وردی عام ہے ملا ، حافظ ، بساطی ، دھوبی ، بھٹیارہ ، جولاہا ، کنجڑا منہ پر داڑھی رکھتا ہے ۔ سر پر بال ۔ فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا ۔

شادی اور اولاد

تیرہ برس حوالات میں رہا ۱۷ رجب ۱۲۲۸ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا ایک بیڑی پاؤں میں ڈال دی اور شہر دہلی کو زندان مقرر کیا ۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا ۔ برسوں کے بعد اس جیل خانہ سے بھاگا ۔ تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا ۔ پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا ۔ جب دیکھا قیدی گریز پا ہے دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں ۔

مذہب

میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں ۔ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ لا موثر فی الوجود اللہ سمجھے ہوئے ہوں ۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الاطاعت تھے ۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی یہ خاتم المرسلین اور رحمتہ اللعالمین ہیں ۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت نہ اجتماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہیں ثم حسین اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام ۔

بریں زیستم ہم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں ۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہو گا بلکہ دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا تاکہ مشرکین اور منکرین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں ۔

کلکتہ کا سفر

کلکتے کا جو ذکر کیا تونے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنین بتان خود آرا کہ ہائے ہائے

میں کلکتہ گیا ۔ نواب گورنر جنرل سے ملنے کی درخواست کی ۔ دفتر دیکھا گیا میری ریاست کا حال معلوم کیا ۔ ملازمت ہوئی ۔ سات پارچے اور جیغہ ۔ سرپیچ مالائے مروارید یہ رقم خلعت ملا ۔

دہلی میں ملازمت

بادشاہ دہلی نے ۴ جولائی ۱۸۵۰ میں مجھے نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمت تاریخ نگاری سلاطین تیموریہ مجھے تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرز

تازہ پر لکھی۔

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

جب حضور میں حاضر ہوتا تو اکثر بادشاہ مجھ سے ریختہ طلب کرتے جو پڑھی ہوئی غزلیں کیا پڑھتا نئی غزل کہہ کر لے جاتا۔ ایک صاحب شہزادگان تیموریہ سے لکھنؤ سے ایک زمین لائے حضور نے خود ہی غزل کہی اور مجھے بھی حکم دیا۔ یہ غزل لکھی۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

بھائی خدا کے واسطے داد دینا۔

جوانی

مغل بچے غضب کے ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر ایک ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔

مالی حالت

نہ جزا نہ سزا، نہ عدل نہ نہ ظلم، نہ لطف نہ قہر پہلے دن کو روٹی رات کو شراب ملتی تھی اب صرف روٹی مل جاتی ہے۔ اس ناداری کے زمانے میں جس قدر کپڑا اوڑھنا بچھونا گھر میں تھا سب بیچ بیچ کر کھا لیا گیا اور لوگ روٹی کھاتے تھے میں کپڑا کھاتا تھا۔

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب جس کی قسمت میں عاشق کا گریباں ہونا

بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آ گیا ہے۔ رمضان کا مہینہ روزہ کھا کھا کر کاٹا۔ خدا رازق ہے کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔ جب ایک چیز کھانے کو ہوتی اگرچہ غم ہی تو غم کیا ہے۔

قید کا واقعہ

کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ نا واقف، فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ سیشن جج باوجود میرا دوست اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اس نے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا مگر کسی نے نہ سنا اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کہ کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور میری رپورٹ کی اور وہاں سے رہائی کا حکم ملا۔ دیکھئے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید ہے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا ہے نجات پاؤں۔

غدر کے حالات

مئی ۱۸۵۷ میں فلک نے یہ فتنہ اٹھایا - غدر میں میرا گھر نہیں لٹا مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹا - بھائی ضیا اللہ اور ناظر حسین مرزا ہندی فارسی نظم و نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے سو ان دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی - اسی ہنگامے ایک روز کچھ گورے میرے مکان میں گھس آئے تھے مگر انہوں نے اپنی نیک خوئی سے گھر کے اسباب کو بالکل نہیں چھڑا - کرنل براؤن کے رو برو لے گئے - کرنل نے نہایت نرمی اور انسانیت سے سارا حال پوچھا اور رخصت کر دیا -

میرا حال سوا میرے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا - پوچھو کہ غم کیا ہے غم مرگ ، غم فراق ، غم رزق ، غم عزت کہ یہ کوئی نہ سمجھے میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں - کجھ دوست ، کجھ عزیز ، کچھ شاگرد ، کچھ معشوق ، مسودہ سب کے سب خاک میں مل گئے - ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کی زیست کیوں کر نہ دشوار ہو -

ایک جنم تھا کہ جس میں طرح طرح کے معاملات مہر و محبت در پیش آئے - ناگاہ وہ زمانہ نہ رہا نہ وہ اختلاط نہ وہ انسباط — میں جس شہر میں رہتا ہوں اس کا نام دلی ہے اور اس محلہ کا نام بلیماران کا محلہ ہے -

۱ گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انسان کا
۲ چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
۳ شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

شراب و آم کا شوق

جب دو جرعے پی لیے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی - دل توانا دماغ روشن ہو گیا- آم ہے خیر یہ عطیہ بھی بے حاصل ہے بلکہ نعم البدل ہے - ایک ایک کو سر مہر گلاس سمجھا واہ کسی حکمت سے بھرا ہوا ہے کہ ٦٥ گلاس میں سے ایک قطرہ نہیں گرا ہے -

سخن سرائی

خاکسار نے ابتدائے سن تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی ہے پھر اوسط عمر میں بادشاہ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہے - نظم و نثر کا عاشق و قائل ہوں - ہندوستان میں رہتا ہوں - مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں - جہاں تک زور چل سکا فارسی زبان میں بہت بکا - ایک اردو کا دیوان بارہ سو بیت کا - ایک فارسی کا دیوان دس ہزار کئی سو بیت کا - تیں رسالے نثر کے -

یہ پانچ نسخے مرتب کیے ۔ اب اور کیا کہوں گا ۔ مدح کا صلہ نہ ملا ۔ غزل کی داد پائی ۔ ہرزہ گوئی میں ساری عمر گنوائی ۔

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

خستہ حالی

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب اب عناصر میں اعتدال کہاں

یہاں خدا سے بھی توقع نہیں مخلوق کا کیا ذکر ۔ اب آپ تماشائی بن گیا ہوں ۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے آپ کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ ''لو غالب کے ایک اور جوتی لگی ۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بہت بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں آج دور دور تک میرا جواب نہیں'' لے اب قرضداروں کو جواب دے ۔

قرض کی پیتے تھے مے اور سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

میں بیمار ہو گیا ۔ بیمار کیا ہوا توقع زیست کی نہ رہی ۔

سترہ بہترہ اردو میں ترجمہ پیر خذف کا ہے ۔ میری بہتر برس کی عمر ہے حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں ۔ سامعہ باطل بہت دن سے تھا ۔ رفتہ رفتہ وہ بھی حافظے کے مانند معدوم ہو گیا ۔ اب یہ حال ہے جو دوست آتے ہیں رسمی پرسش مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے وہ کاغذ پر لکھ کر دیتے ہیں ۔ غذا مفقود ہے ۔ صبح کو قند اور شیرۂ بادام مقشر ، دوپہر کو گوشت کا پانی ، سر شام تلے ہوئے چار کباب ، سوتے وقت پانچ روپے بھر شراب ، اسی قدر گلاب خذف ہوں ، پوچ ہوں ، عاصی ہوں ، فاسق ہوں ، روسیاہ ہوں ۔

ضعف نہایت کو پہنچ گیا ۔ رعشہ پیدا ہو گیا ۔ بینائی میں بڑا فتور پڑا ۔ حواس مختل ہو گئے ۔ اعصاب کے ضعف کا یہ حال کہ اٹھ نہیں سکتا ۔ اگر دونوں ہاتھ ٹیک کر چارپایہ بن کر اٹھتا ہوں تو پنڈلیاں لرزتی ہیں ۔

دم واپسیں سر راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

آخری عمر

میں اب انتہائے عمر پائیدار کو پہنچ کر آفتاب لب بام اور ہجوم امراض جسمانی اور آلام روحانی سے زندہ درگور ہوں کچھ یاد خدا بھی چاہیے ۔ اب مرگ ناگہاں کہاں رہی ۔ اسباب و آثار سب جمع ہے ۔

نظم و نثر کے قلمرو انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام ونشان باقی رہے گا

کیستم من کہ جاوداں باشم　　چوں نظیری نماند و طالب مرد
ور بگویند در کدامیں سال　　مرد غالب بگو کہ غالب مرد

۱۲۷۷ھ

۱۲۷۷ھ والی بات غلط نہ تھی ۔ وہ وبا بھی کیسی جس میں ایک بہتر سال کا بڈھا اور سڑسٹھ سال کی بڑھیا نہ مر سکی مگر میں نے اس وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا واقعی اس میں میری کسر شان تھا ۔ بعد رفع فساد دیکھ لیا جائے گا۔

ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

(تاریخ وفات ۱۵ فروری ۱۸۶۹)

”قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دعوے میرے خالق نے مجھ میں بھر دئے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں آئے — نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں ۔ اگر تمام عالم میں نہ ہوسکے نہ سہی جس شہر میں رہوں اس میں تو کوئی بھوکا ننگا نظر نہ آئے وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود دربدر بھیک مانگے ،میں ہوں ۔“

تصانیف

۱- دیوان اردو ترتیب ۱۸۲۱
۲- گل رعنا اردو ترتیب ۱۸۲۸-۹
۳- میخانۂ آرزو ،، ۱۸۳۵
۴- دیوان اردو طبع اول ۱۸۴۱
۵- دیوان فارسی طبع اول ۱۸۴۵
۶- پنج آہنگ طبع اول ۱۸۴۹
۷- مہر نیمروز طبع اول ۱۸۵۵
۸- قادر نامہ غالب ترتیب ۱۸۵۶
۹- دستنبو طبع اول طبع ۱۸۵۸
۱۰- قاطع برہان ۱۸۶۲
۱۱- کلیات نظم فارسی ۱۸۶۳
۱۲- مثنوی ابر گہر بار ۱۸۶۴
۱۳- اسمائے فارسی ۱۸۶۴
۱۴- سوالات عبدالکریم ۱۸۶۴
۱۵- لطائف غیبی ۱۸۶۴
۱۶- نامۂ غالب ۱۸۶۵

۱۷- درفش کاویانی
طبع دوم قاطع برہان ۱۸۶۵
۱۸- نکات ورقعات غالب فارسی ۱۸۶۷
۱۹- تیغ تیز (فارسی) ۱۸۶۷
۲۰- سبد چین (فارسی) ۱۸۶۷
۲۱- کلیات نثر فارسی ۱۸۶۸
۲۲- عود ہندی (مکاتیب) ۱۸۶۸
۲۳- اردوئے معلیٰ ،، ۱۸۶۹
۲۴- سبد باغ دودر ۱۸۷۰
۲۵- دعاء صباح
۲۶- مکاتیب غالب ۱۹۳۷
۲۷- متفرقات غالب ۱۹۴۷
۲۸- نادرات غالب ۱۹۴۹
۲۹- مآثر غالب ۱۹۴۹
۳۰- غالب کی نادر تحریریں ۱۹۶۱
۳۱- مجموعہ نثر غالب اردو ۱۹۶۷
۳۲- دیوان اردو نسخہ امروہہ ۱۹۶۹

محمود احمد سحر

غالب کے ذہن و مزاج کا تجزیہ

اردو غزل 'اپنی ابتدا سے غالب کے عہد تک' جس کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ اپنا سفر طے کرتی ہے ، جن پیش پا افتادہ خیالات اور ایسے ہی تصورات کو اپنے ساتھ لے کر چلتی ہے ان کے پیش نظر بھی ہم اسے 'نو کلاسیکی' کہہ سکتے ہیں - اس لیے کہ کلاسیکیت کے علاوہ 'نو کلاسیکیت' کی اصطلاح بھی انگریزی ادب میں استعمال کی گئی ہے جو کلاسیکیت کی ہی تجدید ہے - اس اصطلاح کا رواج اور اس کا گہرا اثر انگریزی ادب میں آگسٹن عہد میں ساتھ ہی فرانس میں لوئی چودھویں کے عہد میں کفی رہا' - عموماً نو کلاسیکیت سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ ایسا ادب جس کی جڑیں دور دور تک کلاسیکیت کی زمین میں پیوست ہوں - جس میں کلاسیکی روائیتوں کا رچاؤ بھی ہو اور بندھے ٹکے اصولوں کی پابندی بھی - ایسے ہی ادب کو نو کلاسیکیت کا حامل سمجھا گیا - فرانس میں بوالو (Boileau) نے انہی روایات کے پیش نظر اور انہی روایات کے پیش نظر اور انہی روایات کی موافقت میں L'Art poetique میں اور Empitre میں ادبی قدروں کا تعین کیا ہے جن کے مطابق -

۱- ادب کا مقصد فرحت بخشنا ہے -

۲- حسین وہی ہے جس میں صداقت ہے -

۳- ادیب پر لازم آتا ہے کہ وہ اپنی تخلیق میں صحت و صفائی اور صوری و معنوی نظم و دلاویز اسلوب کا لحاظ رکھے جو کہ فطرت کے مقتضیات میں سے ہیں -

۴- ادیب بدہیتی اور بدصورتی میں بھی حسن اور جمالیاتی امکانات تلاش کر سکتا ہے - جمالیاتی مسرت کے لیے حسن اور خوبصورتی ضروری ہے -

۵- معقولیت اور متقدمین کے ادب و فن کی تقلید ہی آرٹ کو زندۂ جاوید رکھ سکتی ہے -

ان ادبی قدروں میں سے بیشتر ہماری اردو غزل گوئی کی تاریخ کا داخلی اور خارجی طور پر احاطہ کئے ہوئے ہیں ۔ اس لئے غالب کے عہد تک غزل گوئی سے جمالیاتی ذوق کی تسکین اور زن عشوہ طراز کے خیرو شر سے ذہن و مزاج کو آسودگی اور طمانیت بخشنے اور فرحت حاصل کرنے کا کام لیا جاتا رہا ۔ نمایاں بات تو یہ ہے کہ مقبولیت اور متقدمین کے ادب و فن کی تقلید ہی کو فن غزل گوئی کا معیار سمجھا جاتا رہا بقول مسیح الزماں ''میر کے زمانے میں اردو شاعری میں گل و بلبل کے مقررہ اور محدود مضامین سے علیحدہ ہو کر نئی راہیں نکالنا پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا تھا اور۔۔۔جدتوں پر لوگ اعتراض کیا کرتے تھے ۔ اسی نامناسب تقلید نے بالاخر رسمی شاعری کے وہ دفتر اکٹھا کر دئے جو کسی طرح ہمارے لئے باعث فخر نہیں ۔'' اتنا ہی نہیں بلکہ ضرورت پڑنے پر ثبوت کے لئے متقدمین کی غزلوں کے مختلف اشعار اور تراکیب کو اپنے بچاؤ کے لئے پیش کیا جاتا تھا ، جو اس بات کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اردو غزل میں بھی تقلیدی رجحانات ، تقلید پرستی کی حد تک پہنچے ہوئے تھے اور ان رجحانات کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا ۔

کلاسیکیت اور نو کلاسیکیت ، دونوں ہی اصطلاحات ان آرٹسٹوں اور فنکاروں کے ذہن و مزاج کی نمائندگی کرتی رہی ہیں جو ادب میں معقولیت ، تقلید اور حد بندیوں کے قائل رہے ہیں ۔ ہمارے یہاں ان دونوں اصطلاحات میں سے 'نو کلاسیکیت' کا استعمال غالباً نہیں کیا گیا ہے ۔ علاوہ ازیں ہمارے یہاں کلاسیکی انداز میں کوئی بٹوارہ بھی نہیں ہوا ۔ پھر بھی یہ اصطلاحات جن ادبی قدروں اور معیاروں کو اپنے ساتھ لیکر چلی ہیں ، وہی قدریں وہی معیارات ہمارے یہاں شعوری یا غیر شعوری طور پر رائج رہے ۔ چنانچہ ان اصطلاحات کے استعمال سے ہماری اردو غزل کے شعرائے متقدمین کے ذہن و مزاج ان کی پسند و ناپسند کی بابت واضح نقوش ہمارے ذہنوں پر مرتب ہوئے ہیں ۔ یہ دونوں اصطلاحات ان کے ذہن و مزاج کی پوری پوری عکاسی کرتی ہیں ۔

لیکن غالب کے یہاں ان دونوں اصطلاحات کا جادو نہیں چلتا ۔ جب ہم غالب کے ذہن و مزاج کا تجزیہ کرتے ہیں تو غالب کے یہ الفاظ ہمیں بری طرح چونکا دیتے ہیں ۔

''یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو کچھ لکھ گئے ہیں وہ حق ہے ، کیا اُس وقت آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے ۔''

یہ ہوش مندی یہ جسارت ، یہ اعتماد اور یہ روایت شکنی جو غالب کی مندرجہ بالا تحریر میں ہے ، غالب سے قبل کسی بھی غزل گو شاعر یا ادیب کے یہاں نہیں ملے گی ۔ تردید و تنسیخ کا یہ ذہنی عمل غالب کے ذہن و مزاج کا نمائندہ ہے ۔ اُس ذہن و مزاج کا جس میں بے پناہ انانیت ، جسارت ، بغاوت ، خود اعتادی ،

خودداری اور جذباتی پارہ صفتی تھی جسے کبھی کسی ایک پہلو قرار نہیں ہوتا جس طرح روسو کی اس آواز کو ''انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جہاں دیکھو پابہ زنجیر ہے'' رومانویت کا مطلع کہا جاتا ہے ۔ اسی طرح غالب کی اس عظیم آواز کو ''یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو کچھ لکھ گئے ہیں وہ حق ہے ، کیا اس وقت آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے ۔'' اردو ادب کی رومانویت کا مطلع کہہ سکتے ہیں ۔

چاہے وہ اردو نظم ہو یا اردو نثر ، غالب نے دونوں میں ہی روایت شکنی سے کام لیا ہے ۔ ایسا کرکے غالب نے نہ صرف اپنے عہد پر ہی احسان کیا بلکہ آئندہ نسلوں کے ذہن و مزاج کو بھی پوری طرح متاثر کیا اور ایک زبردست تبدیلی کی داغ بیل ڈالی ۔ بقول مجنوں گورکھپوری ''آج غالب نہ ہوتا تو ابھی حالی اور اقبال کی متوازن ، سنجیدہ اور زندگی سے آنکھیں ملا سکنے والی شاعری کے وجود میں آنے میں نہ جانے کتنی دیر لگتی ، اور ہماری اردو شاعری موجودہ منزل تک نہ جانے کب پہنچتی ۔'' اردو ادب اپنے تنگ دائروں کے اندر ہی رینگتا رہتا اور ہر آنے والا یہ یقین کر لیتا کہ یہ سراب ہی دراصل اس کی روشن ترین منزل ہے ۔

غالب جو اردو ادب میں ایک زبردست تبدیلی کے محرک اور بانی تھے ۔ اس عہد مغلیہ کی تہذیب زوال آمادہ کی یادگار تھے جس میں قدیم و جدید تہذیبیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں اور جن کے ٹکراؤ سے ایک نئی تہذیب کا جنم ہو رہا تھا ۔ پرانے نقوش مدھم پڑتے جا رہے تھے اور ان کی جگہ نئے نقوش ابھر رہے تھے ۔ پرانی قدریں ختم ہو رہی تھیں اور نئی قدریں وجود میں آ رہی تھیں ۔ اس عبوری عہد کا ہر ہنگامہ ، ہر اس انسان کے لیے جو چاہے فنکار ہو یا نہ ہو ، بڑا ہولناک اور قیامت خیز تھا ۔ غالب ایسے ہی ''بڑے معرکے کے عہد میں پیدا ہوئے تھے ۔ جس سے عہدہ برا ہونا غالب ہی کا کام تھا ۔ ایسے عہد کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس کا ہیرو نہ خود کسی کا پیرو بن سکتا ہے نہ کوئی اس کا پیرو ہوتا ہے'' دیوان غالب اور 'خطوط غالب' اس کی روشن ترین مثال ہیں جو اپنے اختصار کے باوجود اردو کے فن و ادب میں ایک سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں ۔

غالب کا ایک ایک خط اور ہر خط کی ایک ایک سطر ، ان کی تہ دار اور ہمہ گیر شخصیت کو ماضی کی تاریک وادیوں سے نکال کر روشنی کے بلند و بالا مینار کی طرف لے جاتی ہیں ۔ جہاں سے غالب اپنی جملہ رومانوی خصوصیات کے ساتھ صاف دکھائی دینے لگتے ہیں اور جب ہم ان کی شخصیت کا مطالعہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کے ایک نہیں کئی روپ ہماری نگاہوں کے سامنے اپنی کرشمہ سازیوں کا جال اس طرح بکھیر دیتے ہیں کہ نگاہیں ان میں الجھ کر رہ

---

۱ ۔ ''ادب اور زندگی'' مجنوں گورکھپوری صفحہ ۳۱۶ ۔

جاتی ہیں ۔ متجسس نگاہوں کے سامنے غالب کی ایک سے ایک قدآور شخصیت اُبھرتی ہے جن کے مختلف موڈ اور مختلف رنگ ہوتے ہیں ۔

غالب کا سب سے بڑا مذہب تھا ان کی انسان دوستی ۔ چنانچہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں ۔

''میں تو بنی آدم کو ، مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی ، عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں ۔''

اس لیے وسیع المشربی اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ ان کے یہاں موجود ہے ۔ اس کے علاوہ وہ بلا کے خوددار اور انانیت پسند بھی تھے ۔ لیکن شگفتگی، خوش طبعی اور بذلہ سنجی میں بھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے ۔ فراخدلی اور حوصلگی بھی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔ ان کا حلقۂ احباب نہایت وسیع تھا اور اس حلقے میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل تھے ۔ وہ سراپا اخلاق بھی تھے اور وضع قطع کے پابند بھی ۔ ان کے اپنے اصول بھی تھے جن پر آخر دم تک قائم رہے ۔ لیکن ان تمام صفات کے باوجود بھی انہوں نے ایک ایسی طبیعت ، ایسا مزاج پایا تھا جس کی دلکشی اور رنگینیاں بھی کم رومانوی نہ تھیں ۔ انہیں اپنی عزت اور مرتبے کا اتنا خیال رہتا ہے کہ وہ دہلی کالج کی پروفیسری محض اس لئے ٹھکرا کر چلے آتے ہیں کہ سیکریٹری حکومت ہند اُس جذبے کے ساتھ ان کا استقبال کرنے کے لئے نہیں آتے جس کی کہ وہ توقع رکھتے تھے ـــــ لکھنؤ سے گزرتے وقت روشن الدولہ نائب السلطنت سے ملاقات کی شرطیں وہ خود اپنی جانب سے پیش کرتے ہیں وہ بھی اس طرح نائب السلطنت ان کو تعظیم دیں اور دوسرے یہ کہ وہ خود کسی قسم کی نذر نائب السلطنت کو پیش نہیں کرینگے ۔ غالب کی زندگی کے یہ یا اس قسم کے اور واقعات ان کے مزاج کی خود داری ، انانیت اور بے جگری کا بہترین نمونہ ہیں ۔ وہ اپنی عظیم المرتبت شخصیت سے دوسری بڑی شخصیتوں کو متاثر اور مرعوب کرکے چلنے کے عادی تھے ۔

جہاں غالب کے مزاج اور شخصیت کا یہ پہلو جاندار اور شاندار ہے وہاں ان کی زندگی کا یہ رخ بھی کم دلچسپ نہیں کہ وہ زندگی بھر کرائے کے مکانات میں رہا کیے ۔ جن کی چھتوں پر ابر دو گھنٹے برسے تو چھتیں چار گھنٹے برسیں ۔ مفلسی کا یہ عالم کہ بیشتر کرایہ بھی ادا نہ کر سکے ۔ موڈ (Mood) کی بادشاہت کا یہ رنگ کہ دوستوں کو جو خطوط لکھے ان میں اپنا کچا چٹھا سب کھول کر رکھ دیا ۔ جہاں ایک طرف وہ فرما روائے انگلستان ملکہ وکٹوریہ سے خطاب اور خلعت فاخرہ طلب کرتے ہیں ، وہاں دیگر حکام سے اپنے آپ کو چار سواروں کا افسر بھی کہتے جاتے ہیں اور دوستوں کو یہ بھی لکھتے جاتے ہیں کہ ''اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں ۔ بعد اس کے نہ کہیں قرض کی امید ہے نہ کوئی جنس

رہن و بیع کے قابل ۔" کبھی اپنے آپ کو آدھا مسلمان کہتے ہیں تو کبھی یہ بھی کہ "تمام عمر میں ایک دن بھی شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار ۔" کبھی قید خانے کی سلاخوں کے پیچھے بند نظر آتے ہیں تو کبھی دربار ہند میں جلوہ افروز ۔

اس طرح غالب کا مزاج اور کردار ، دونوں ہی اردو ادب کے ان تمام فنکاروں کے مزاج اور کردار سے زیادہ ، جزباتی ، جاندار اور شاندار تھے جنھیں ہم کلاسیکی اور نو کلاسیکی ادباء اور شعراء کے درجے میں جگہ دیتے ہیں۔۔۔غالب رزم گہہ زندگی میں اپنے سپاہیانہ تیور اور مجاہدانہ صلاحیتوں کا بھر پور مظاہرہ کرتے ہیں۔۔۔کلکتہ کا سفر ہو یا قاطع برہان کا جھگڑا ، غدر کا ہنگامہ ہو یا عزیزوں اور دوستوں کا ماتم۔۔۔سیلاب بلا ہو یا موت کی حکمرانی ، وہ ہر جگہ زندہ اور شوخ نظر آتے ہیں ۔ ان کی طبیعت اور مزاج کا کچھ یہی رنگ تھا کہ حادثات کے غالب آ جانے کے باوجود بھی وہ حادثات پر غالب نظر آتے ہیں ۔

غالب کے سمجھنے میں ہمیں ان کے خطوط سے بڑی مدد ملتی ہے ۔ غالب کے خطوط ایک ایسا آئینہ ہیں جس میں غالب اپنے اصل خد و حال کے ساتھ واضح طور پر دکھائی دینے لگتے ہیں۔۔۔اور یہ خطوط ہی غالب شناسی کی کئی منزلیں طے کرا دیتے ہیں۔۔۔خطوط ، غالب سے قبل بھی لکھے جاتے رہے تھے ۔ القاب و اداب کی پابندیوں اور مقفیٰ مسجع عبارت آرائیوں کے گل بوٹے کھلائے جاتے رہے ، لیکن تحریر کی سادگی کا حسن ان دیدہ وروں کو نظر نہ آیا۔۔۔اس طرف نظر گئی تو غالب ہی کی ۔ خطوط کی زبان میں انداز گفتگو کا سلیقہ کسے نصیب ہوا ۔؟ کسی کو بھی نہیں۔۔۔اس کا سہرا بھی غالب ہی کے سر ہے۔۔۔غالب ہی وہ پہلے نثر نگار ہیں جنھوں نے مکتوب نگاری کے قواعد و ضوابط اور جملہ روایتی پابندیوں پر ایک خط تنسیخ کھینچ دیا اور مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ، اس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں ۔

"مرزا صاحب میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے ۔

ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو اور ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو ۔"

صرف اتنا ہی نہیں کہ غالب نے خطوط نویسی کو رسمی پابندیوں سے آزاد کر دیا بلکہ نثر میں ایک ایسے انداز بیاں اور طرز تحریر کی بنیاد ڈالی ، جو سادگی ، شگفتگی اور شوخی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی ۔

خطوط نویسی اور نثر نگاری میں غالب کا یہ شعوری کارنامہ تھا ۔ اس کارنامے کے انجام دینے میں بھی ان کے ذہن و مزاج کا ذبردست دخل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خطوط نویسی کے میدان میں بھی عام روایت سے گریز کرتے ہیں اور ان کا یہ گریز اتنا

جاندار ہوتا ہے کہ لوگ اس کی پیروی کے لیے بیدل اور انشائے مادورام کو فراموش کرکے غالب کے پیچھے پیچھے چل پڑتے ہیں -

غالب کے خطوط کی مختلف تحریریں ان کی زندگی کے نہ صرف نشیب و فراز سے ہی متعارف کراتی ہیں بلکہ ان کے ذہن و مزاج کی رو سے بھی مکمل واقفیت عطا کرتی ہیں - جن میں غالب کے ذہن و مزاج کی ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ موضوع ، اسلوب اور لفظوں کی بولتی ہوئی آوازیں ایک دوسرے سے اٹوٹ رشتہ قائم کر لیتی ہیں - اس رشتے کی تہہ میں جو تخلیقی جذبہ کارفرما رہتا ہے وہ ادبی اور سماجی پابندیوں کو شکست و ریخت میں تبدیل کر کے انہیں ایک نئی جسامت اور روح کی تازگی کے ساتھ زندہ رہنے کے فن سے بھی آشنا کرتا ہے -

حالانکہ مرزا غالب کی ابتدائی زندگی کے متعلق ان کے خطوط کے سے خاطر خواہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں لیکن اتنی واقفیت ضرور ہو جاتی ہے کہ وہ خاندانی اعتبار سے مغل تھے ، ان کی ننہیال آگرہ کے ممتاز گھرانوں میں سے تھی اور ان کا بچپن نہایت خوشگوار اور خوشحال ماحول میں گزرا تھا جس میں دل و دماغ کے لیے صہبائے نشاط انگیز بھی تھی اور ہنگاموں کی تسکین کے لیے مہکتے ہوئے شاداب جلووں کی بہاریں بھی---ان کی ''ننہیال خوش حال تھی اس لیے عیش و آرام اور لہوولعب کے سارے وسیلے میسر تھے ،،' اس قسم کے آسودہ ماحول میں ذہن مزاج کی تربیت اور تعمیر کسی پابندی کو برداشت کرنے کی عادی نہیں ہوتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک معمولی صلاحیتوں کا انسان اپنے کردار کی اٹھان کی طرف متوجہ نہ ہو کر ان راستوں پر چل پڑتا ہے جہاں اس کے کردار کی تباہی کے لوازمات اپنی الفاظ کے ساتھ اسے اپنے نرغے میں لے لیتے ہیں ، پھر وہ منزل بھی آتی ہے جب اس کا کردار ، ماحول اور سماج کے لئے تکلیف دہ اور ناقابل برداشت بن جاتا ہے- اس کے برعکس غیر معمولی ، صلاحیتوں کا انسان اپنے کردار کی تعمیر میں خود زبردست کارنامے انجام دیتا ہے ، نہ وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ نا انصافی سے کام لیتا ہے اور نہ اپنے مزاج کو کسی ایک خاص ماحول کا عادی بنا لیتا ہے - غالب کا رول ، اپنے کردار کی تعمیر میں کچھ ایسا ہی رہا -

بقول ڈاکٹر خورشید الاسلام ''غالب کی ذہنی ترقی کی رفتار ان کی عمر کے مقابلے میں ضرورت سے زیادہ تیز تھی ،،'[2] اس لئے ان کو دور رس نگاہیں بڑی معاملہ فہم تھیں ، وہ زندگی کے نشیب و فراز پر گہری نظر بھی رکھتے تھے ، نجی زندگی میں ایک خاص روحانی سکون کے تمنائی تھے اور ادبی زندگی میں خود کو ایک بلند و بالا مقام پر دیکھنا چاہتے تھے ، اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے انہوں نے ذہن و عمل کی آزادی کو پسند کیا ، لیکن ذہن و عمل کو اس آزادی میں وہ آس

یکسانیت اور عمومیت کے قائل نہ رہے جو زندگی کے ہنگامہ خیز حسن سے اس کی جمالیاتی خوبیاں چھین کر اسے مفلوج اور کنگال بنا دیتی ہو ۔

ان ہی خیالات اور احساسات کے پیش نظر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شادی بیاہ کی ہنگامہ آرائیاں ہوں یا شادی خانہ آبادی کی رنگینیاں ــ یہ ایک عام انسان کے لئے تو حسرتوں کا بیش بہا خزانہ ہوسکتی ہیں لیکن اس فن کار کے لئے ہرگز نہیں جس کے فن کا شعر ایک طویل اور خطرناک شعر کی حیثیت رکھتا ہو ، جس کے راستوں میں خاردار پودے ، خشک خشک جھاڑیاں اور بے آب و گیاہ ریگستان ہوں ، جس کا تعاقب دیوقامت سائے کر رہے ہوں ، جن کی گرفت سے بچ نکلنا آسان کام نہیں ہوتا ، غالب جانتے تھے کہ انھیں ایک ایسے ہی سفر کی تیاری کرنا ہے ۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے پیروں میں زنجیر پہنا دی جائے ۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ ان کا یہ فنی اور ادبی سفر ان کے لیے اور دقت طلب بن جائے ، لیکن زندگی کے ابتدائی سفر میں ان کے ساتھ ایسا ہی ہوا ان کے پاؤں میں ایک بیڑی ڈال دی گئی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا گیا ، جس کا ذکر انھوں نے اس طرح کیا :

''۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا ، ایک بیڑی (یعنی بیوی) میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا ۔،،[۱]

یہاں غالب کی تحریر کا تیکھا پن ، شوخیٔ طبع سے زیادہ حقیقت کی تلخی پر زور دے رہا ہے ، ان کی رفیقۂ حیات کوئی ایسی جنس بے وقعت نہ تھی ، جس کا ذکر وہ جب چاہتے جس انداز سے ، غیروں کی محفلوں میں کرتے پھرتے یا خطوط کے ذریعے آپسے ایک جگہ سے دوسری جگہ روانہ کرتے رہتے ، ان الفاظ کا تیکھا پن ''زندان'' اور ''حبس دوام'' کی علامتوں کو لیکر ان پابندیوں کا اظہار کر رہا ہے ، جنھیں وہ عمر کے ایک خاص حصے تک پسندیدگی کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے ، نہ ایک ایسے المیہ کا بیان ہے جو طربیہ ہونے کے باوجود بھی المیہ ہے ، اس لیے کہ غالب اپنی کم عمری میں ہی اپنی رفیقۂ حیات کی ان زلفوں کے اسیر بنا دئے گئے جنھوں نے ایک فنکار سے کسی حد تک آس آزادی کو چھین لیا جو اس کی زندگی کا پہلا نصب العین ہوا کرتی ہے ۔ غالب جنکی ذہنی ترقی کی رفتار انکی عمر کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیز تھی ، خانگی زندگی کی الجھنوں کا شکار بننا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ ایک حقیقی فنکار کی طرح ، اس دنیا کو جو دیکھنے ، سمجھنے اور برتنے کی چیز ہے ، ایسے آسی آزادی سے دیکھنا ، سمجھنا اور برتنا چاہتے تھے جسکی کہ وہ متقاضی تھی ۔ لیکن نتیجہ اس کے برعکس ہوا ۔

---

۱ 'غالب نامہ' اکرام ص ۲ 'غالب' خورشید الاسلام ص ۲۶

اس موضوع کے تحت غالب کی زیر بحث تحریر ان کے ذہن و مزاج کی اس رو سے آشنا کراتی ہے جو ماحول اور رسم زمانہ کی زبردست پابندیوں کے باوجود بھی حقیقت کا اظہار لئے بغیر چین نہیں لیتی ، اس موضوع کے تحت بھی غالب کے خیالات ، احتیاط اور مصلحت پسندی کو کراس کرکے چلتے ہیں اور ذہن و مزاج کی انفرادیت کا پتا دیتے ہیں ۔ غالب کے ذہن و مزاج کے تجزیے کے سلسلے میں ان کی تحریروں کے یہ اقتباسات بھی ملاحظ فرمائیے :

"میاں بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آگیا ہے ، اس طرف سے خاطر جمع رکھنا ، رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا ، آگے خدا رازق ہے ، کچھ کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔"

"قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دعوے میرے خالق نے مجھ میں بھر دئے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے ، نہ وہ طاقت جسانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکالوں اور پیادہ پاچلدوں ، کبھی شیراز جانکلا کبھی مصر میں جا ٹھہرا ، کبھی نجف جا پہنچا ، نہ وہ دست گاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں ، اگر تمام عالم میں نہ ہوسکے نہ سہی ، جس شہر میں رہوں اس میں تو (کوئی) بھوکا ننگا نظر نہ آئے ، خدا کا مقہور خلق کا مردود ، بوڑھا ناتواں ، بیمار ، فقیر ، نکبت میں گرفتار ۔ میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو ، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود دربدر بھیک مانگے وہ میں ہوں ۔،،

پہلے اقتباس میں غالب نے خود اپنا اور اپنے اس ماحول کا مذاق اڑایا ہے جس کے ظاہر و باطن کا تضاد ، دونوں کو ان چمکتی ہوئی چیزوں کی طرف لے گیا جو سونا نہیں تھیں ، فاقہ مستی کے باوجود جہاں جام و شراب کے بغیر بات آگے نہیں بڑھتی تھی ، جہاں وضع داری کی بوڑھی بیساکھیوں کے پیروں میں ارتعاش پیدا ہو چکا تھا ، جہاں خودداری خود اپنے قدموں میں ہی گر جانے کی عادی ہوگئی تھی۔ منصب داری ، کچھ دیر کے لئے ویران آنکھوں میں ایک چمک پیدا کر دیتی تھی اور پھر آسی منحوس ویرانی کو واپس لا کر پھینک دیتی تھی جو ان کا مقدر اور خزاں رسیدہ ماحول کی پروردہ تھی ۔

دوسرے اقتباس میں بھی غالب اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے کھڑے نظر آتے ہیں ، وہ اپنی ایک ہتھیلی پر اپنا دھڑکتا ہوا ہمدرد اور حساس دل لیے ہیں اور دوسری ہتھیلی پر نامرادی اوز کنگالی کے دہکتے ہوتے انگارے—اور ان کے پیروں کے نیچے رومانوی کرب کی وہ دلدل ہے ، جس سے باہر نکلنے کی کوشش ، انہیں اور بھی اپنے اندر سا لیتی ہے ، جب وہ اس کے اندر کچھ اور بھی اتر جاتے ہیں ، تو آس کی زندگی مردوں کی بستی سے بد تر جس میں قبریں تو ہوتی ہیں مگر یہ نہیں ہوتا کہ

نیم مردہ انسانوں کو گدھ اور کوے نوچنے لگیں، سسکتے ہوئے ذہن و جسم نہ اپنی بے چارگی کا پوری طرح ماتم کر سکیں، نہ اپنے آپ کو گھسیٹ کر نجات کی منزل کی طرف لے جاسکیں۔ اس اقتباس میں غالب کا رومانوی کرب اپنے عروج پر ملتا ہے۔

غالب نے اپنی شوخئی تحریر کے ہاتھوں، تلخ ترش حقائق کے منحوس چہروں سے تمام نقابیں نوچ کر پھینک‌دی ہیں اور ان بستیوں کو آگ لگائی ہے جنھوں نے کبھی روشنی کی صورت نہیں دیکھی ، ان ہنگاموں کو بیدار کیا ہے جو دوسروں کی دسترس سے باہر تھے ، ان دہلیزوں پر سر پھوڑا ہے جن پر قدموں کے سائے بھی نہ پڑے تھے ، ان فنی گوشوں کو چھوا ہے جن تک پہنچنے میں ان کی انگلیاں زخم آلودہ ہوئیں ، ان موضوعات کو چھیڑا ہے جن کی جڑیں زندگی میں پیوست ہو کر بھی معدوم تھیں ۔ اس زندگی کو منظر عام پر لاکر کھڑا کیا ہے جو شاندار پوشاکوں میں برہنہ تھی ، ان لفظوں میں بات کی ہے جو ہونٹوں تک آتے آتے انگارے بن جاتے ہیں ۔

جب غالب یہ کہتے ہیں کہ ”میں تو اس قابل ہوں کہ جب مروں ، میرے عزیز اوز دوست میرا منہ کالا کریں اور میرے پاؤں میں رسی باندھ کر شہر کے تمام گلی ، کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں ، اور پھر شہر کے باہر لے جاکر کتوں اوز چیلوں ، اور کوؤں کے کھانے کو (اگر وہ ایسی چیزیں کھانا گوارا کریں) چھوڑ آئیں ۔“، تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی ذات اور اپنی شخصیت کو بھی نہیں بخشتے ، شدید جذباتیت کے کوڑے وہ اپنی ذات پر بھی اس طرح برسانے لگتے ہیں کہ دل لرز اٹھتا ہے ۔ پھر اس فنکار کا جی کیا کہتا ہوگا جس نے اپنے بارے میں ان کلمات کا استعال کیا۔ جنھیں دوسروں کے لئے استعال کرنے میں بہت سوچنا سمجھنا اور ہچکچانا پڑتا ہے اور پھر بھی ایسے الفاظ زبان پر نہیں آ پاتے ، اس کی سب سے بڑی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ ”غالب کی زندگی انسان دوستی درد مندی، جرأت اور بے باکی کا ایک ایسا صحیفہ ہے جس سے ہر شخص پڑھ سکتا ہے۔ ظاہر داری اوز ریاکاری ان کے مسلک میں سب سے بڑا گناہ تھی ، انھیں رسوائی ، خواری اور خود آرائی گوارا تھی ، لیکن یہ گوارانہ تھا کہ اپنی شخصیت کو دنیا کے سامنے اس صورت میں پیش کریں جو فی‌الاصل نہیں ہے اور نہ ہوسکتی ہے ، اس لئے اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا اعتراف بھی انھوں نے بڑے اعتاد سے کیا ہے ۔“[1]

غالب نے اپنے خطوط میں جہاں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ، وہاں ان پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا ، جنھیں ، ان سا کوئی دوسرا فنکار اپنے مقام و مرتبے کے پیش نظر ، عوام کے سامنے پیش کرنے کا خیال نہیں نہیں کرسکتا تھا کیونکہ ایسا کرنے میں نہ صرف وقتی طور پر اپنی رسوائی کا اندیشہ ہوتا بلکہ

صفحات پر آ جانے کے بعد انہیں جو ہمیشگی حاصل ہو جاتی وہ ذہن و مزاج کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ آئندہ کسی بھی وقت اس فنکار کی شخصیت اور عظمت کو مجروح و متاثر کرسکتی تھی ، جہاں غالب نے ان کمزور پہلوؤں کو صفحات پر لانے کی جسارت کی۔ وہ زندگی کے ہر حادثے پر لبیک کہا اور ہر اندیشے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے غرور کو چکنا چور بھی کیا ، اس ذیل میں یہ اقتباسات خصوصی توجہ کے مستحق ہیں :-

جہاں پناہ کی مدح کی فکر نہ کر سکا یہ قصیدہ ممدوح کی نظر سے گزرا نہ تھا ، میں نے اس میں امجد علی شاہ کی جگہ واجد علی شاہ کو بٹھا دیا ، خدا نے بھی تو ہی کہا تھا ، انوری نے بارہا ایسا کیا کہ بیک کا قصیدہ دوسرے کے نام پر کر دیا ، میں نے اگر باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام کر دیا تو کیا غضب ہوا۔،،

''لیلیٰ اس کے (مجنوں کے) سامنے مری تھی ، تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری بلکہ تم اس سے بھی بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری ، بھی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اس کو یاد رکھتے ہیں ، میں بھی فعل بچہ ہوں ، عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم دونوں کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں ۔،،

غالب کو خود اس بات کا احساس تھا کہ وہ کائنات شعر و ادب کی ایک بہت بلند و بالا شخصیت کے مالک ہیں ۔ انہیں اس بات پر بھی فخر تھا کہ وہ جس قوم اور جس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس نے تلوار کی دھار پر چلنا سیکھا تھا ، لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اپنے مزاج کی انانیت کے باوجودہ خود تماشا بھی بنتے ہیں اور خود تماشائی بھی ۔ خود کو آسمان کی بلندیوں تک اڑا لے جاتے ہیں اور دوسرے ہی لمحے خود کو زمین پر پھینک دیتے ہیں ، کیونکہ انسانی کمزوریوں کا شکار تھے ، ان کمزوریوں کا جو ہر انسان میں ہوا کرتی ہیں لیکن کوئی انہیں ظاہر کرنانہیں چاہتا ، مگر غالب انہیں ظاہر کرنا چاہتے تھے کیونکہ ایسا کرنے میں وہ ایک خاص لطف ، ایک خاص قسم کا سکون محسوس کرتے تھے ، وہ لکھتے ہیں :

یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں مخلوق کا کیا ذکر ، کچھ بن نہیں آتی ، اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں ، رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں ، یعنی میں نے اپنے آپ کو اپنا غیر تصور کیا ہے ، جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی ، بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں ، آج دور دور تک میرا جواب نہیں ، لے اب تو قرضداروں کو جواب دے ، سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا ، بڑا کافر مرا ، ہم نے ازراہ تعظیم جیسا

بادشاہوں کو بعد انکے جنت آرام گاہ و عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں ، چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا ، سفر مقرباویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے ، آنہی نجم الدولہ بہادر ، ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ ایک قرضدار کو بھوک ستا رہا ہے میں ان سے پوچھ رہا ہوں اجی حضرت نواب صاحب کیسے اور خاں صاحب ، آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں ، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے ، کچھ تو اکسو کچھ تو بولو ، بولے کیا بے حیا بے عزت ، کوٹھی سے شراب ، گندھی سے گلاب ، بزاز سے کپڑا میوہ فروش سے آم ، صراف سے دام قرض لیے جاتا ہے ، یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔،

یوں تو غالب کی تحریروں سے اور بھی کئی اقتباسات پیش کیے جاسکتے ہیں لیکن اس باب میں جو اقتباسات پیش کیے گئے ہیں وہ ثابت کرنے کے کافی ہیں کہ انکے رومانوی ذہن و مزاج ، ان کی نفسیاتی الجھنوں کے بیان میں بھی اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہیں ، نفسیاتی الجھنیں ، اقتصادی یا معاشی بدحالی ہویا ادبی موضوعات کا معاملہ ہر جگہ ایک ہی رومانی فضا ، سب کا احاطہ کیے ہوئے نظر آتی ہے ، ان کا رومانوی ذہن ہر جگہ لبردست کارنامہ انجام دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے ، جہاں وہ خطوط نویسی کی پابندیوں سے انحراف کرکے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیتے ہیں ، وہاں اپنے مکالماتی انداز میں زندگی کی تہہ دار گہرائیوں کو ان کی اصل شکل و صورت میں پیش کرنے کی ایسی جسارت کرتے ہیں جو کہیں اور نہیں ملتی ، اس قسم کی تحریروں میں جب لوگ ذاتی معاملات کی طرف رجوع ہوتے ہیں تو وہ اپنی نجی زندگی اور اس کی کمزوریوں کو کبھی بے نقاب نہیں کرتے ، نہ ان پر ایمانداری سے روشنی ڈالنا ہی پسند کرتے ہیں ، بلکہ وہ اس بات کی کامیاب ترین کوشش کرتے ہیں کہ ان کی زندگی کی کوئی خاص خامی ، کوئی بڑی غلطی ، دوسروں کے علم میں نہ آسکے اور وہ حتی الامکان فرشتہ صفت بنے رہیں - غالب وہ پہلے شخص اور پہلے فنکار ہیں جو نہ صرف ایسا کرتے ہیں بلکہ خود کو جاں ایک طرف ''غالب علیہ الرحمۃ'' لکھتے ہیں تو دوسری طرف اپنے آپ کو ''مردود - کافر - ملحد'' اور ایسے ہی بد سے بدتر الفاظ میں یاد بھی کرتے ہیں -

غالب نے اپنے خطوط میں جہاں ادبی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے وہاں بھی ان کا زاویہ نگاہ دوسروں سے مختلف ہے - روایت کی تقلید اور پیروی نہ وہ خود کرتے ہیں اور نہ ایسا کرنے کا مشورہ وہ دوسروں کو ہی دیتے ہیں - ذہنی انحراف کی فنکارانہ صحت مندی ان کی اس تحریر سے واضح ہو جاتی ہے - جس میں وہ مرزا تفتہ کو مشورہ دیتے ہیں ''اب ہم منع کرتے ہیں عاشقانہ قصائد نہ لکھا کرو - مدح بشرط ضرورت لکھو مگر بہ فکرو غور ،، میر مہدی مجروح سے نامہ نگاری کی قدیم روش کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں '' تمہارا دماغ چل گیا ہے - لفافہ کو کریدا کرو

مسودہ کو بار بار دیکھا کرو ، باؤ کے کیا ؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں ۔ ، ان دونوں اقتباسات میں غالب نے نہ صرف تقلید کو بری نظر سے دیکھا ہے بلکہ یہ بھی چاہا ہے کہ جس طرح وہ خود ادب میں عمومیت کے قائل نہیں اسی طرح ان کے شاگرد یا ان کا حلقہ احباب بھی اس عام ادبی روش سے ہٹ کر چلے جو تخلیقی صلاحیتوں کے نشو نما اور ذہنی فروغ کے لیے نقصان دہ ہے ۔ وہ اس بات کے بھی شدت سے متمنی نظر آتے ہیں کہ ان کی طرح ان کا حلقہ احباب بھی غور و فکر کے مرحلوں میں ایک خاص قسم کی نمایاں تبدیلی سے کام لے اور ذہنی انحراف کا ثبوت دے ۔ تخلیق میں جدت ، ندرت اور تجربے کا عمل دخل ہو ۔ اور اس طرح قدامت پرستی اور تقلیدی رجحانات کو ذہنی سرحدوں سے اتنی دور لے جا کر دفنا دیا جائے کہ پھر ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہے ۔

غالب کے ذہن و مزاج کی رومانویت یہاں ان کے شعری کارنامے میں موجود ہیں ، وہاں ان کے خطوط میں بھی اس کی بھر پور عکاسی ملتی ہے ۔ وہ" طریقۂ راسخۂ قدماء" سے علیحدہ طریقے اور علیحدہ راستے اپناتے ہیں اور ان پر بڑے کرو فرسے گامزن نظر آتے ہیں ۔ وہ قدیم ضابطہ بندیوں اور معیاروں کو جو ، شعوری اور غیر شعوری طور پر ہمارے ادب کی کسوٹیوں کا کام انجام دے رہے تھے ، پوری طرح جھٹلا کر چلتے ہیں ۔ وہ " محمد شاہی روشوں" کی دقیانوسیت اور اس کی سہل پسند قدامت پر ایک کاری ضرب لگاتے ہیں ۔ تقلید ، اصول پرستی اور میانہ روی کی بنیادی قدروں کو جنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں اور پھر یوں کہتے ہیں کہ کیا اس زمانے میں احمق پیدا نہیں ہوتے تھے ۔ غالب کی یہ " ساعقہ بردوش بغاوت " غالب کی زبردست جذباتیت ، جسارت ، انانیت ، اور انفرادیت کا نتیجہ تھی ۔ یہ انتہا پسندی جو رومانویت کا ایک لازمی جزو ہے ، غالب کے یہاں بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ پائی جاتی ہے ۔

ڈاکٹر محمد حسن ایک جگہ لکھتے ہیں ۔ "رومانوی ادیبوں اور شاعروں نے اداسی درد اور کرب کو اپنی شخصیت کا جوہر بنا لیا ۔ ان کے نزدیک زندگی کا کوئی پہلو درد اور اداسی کے بغیر مکمل نہیں ہوتا ۔ کہیں خود موت کی آرزو کرتا ہے" کہیں جواں مرگی کو مبارکباد دیتا ہے ، غالب کے یہاں یہ کیفیت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے ۔ اداسی ، درد ، کرب ان کی زندگی اور فن کا وہ لازمی جزو بن گئے تھے جو انکی شوخی اور زندہ دلی کے باوجود بھی ان سے کسی طرح علیحدہ نہیں ہو سکے ۔ جب غالب دہلی کی وبا کا ذکر اس طرح کرتے ہیں" ۔ بھئی کیسی وبا ؟ جب ایک ستر برس کے بڈھے اور ستر برس کی بڑھیا کو نہ مار سکی تو تف برین وبا" تب یہ بات شدت سے محسوس ہوتی ہے ۔ کہ یہاں بھی انکی رومانوی ذہن و مزاج نے انتہا پسندی سے کام لے کر جس انداز میں زندگی کا ماتم کیا ہے وہ رومانوی درد و کرب کی ، ایک ہی جست میں ، کئی منزلیں طے کر دیتے ہیں ۔

غالب کے ذہن و مزاج کا تجزیہ کئے جانے پر یہ بات کہنے میں ذرا بھی پس و پیش کی گنجائش نہیں رہتی کہ وہ ذہن و مزاج کے اعتبار سے خالص رومانوی واقع ہوئے تھے ۔ تمام تر رومانوی ہنگامے ان کی ذات اور فن کے ساتھ اپنی بے جگری اور جانداری کا ثبوت دے کر چلتے ہیں ـــ غالب نے اپنے خطوط کی اشاعت پر کمربستہ ہو کر خود ایک زبردست کارنامہ انجام دیا ہے ۔ ان کا اس کارنامے میں جس فنی جسارت اور ایمانداری نے جس طرح کا اہم رول ادا کیا ہے اسکا خمیر طبعی ، ذہنی اور فکری ہنگامہ آرائیوں سے اٹھا ہے ۔ ان ہنگامہ آرائیوں میں عصری ، سیاسی ، سماجی ، اقتصادی معاشرتی اور تہذیبی ہولناکیوں کی سچائیاں موجود ہیں اور ان سچائیوں میں جو اداسی درد اور کرب ہے ، وہ غالب کی آواز میں سمٹ کر ایسا پھیلاؤ اختیار کر جاتا ہے جس میں غالب کی شخصیت ہولناکیوں پر حاوی ہوتی چلی جاتی ہے اور جملہ پابندیوں کے طلسم شکست و ریخت میں تبدیل ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ جہاں نہ احتیاط کے قدم جمتے ہیں نہ مصلحت کی انگلیوں میں تناؤ پیدا ہوتا ہے اور نہ ان دونوں میں کوئی آپسی سمجھوتہ ـــ ایک طرف غالب ہیں اور دوسری طرف رسم و رواج کی پابندیاں ، فن کی ضابطہ پابندیاں اور روایت و قدامت کی مردہ پرستیاں ـــ لیکن غالب ان سب کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کئے ہوئے تنہا بر سر پیکار نظر آتے ہیں ۔ بڑی مستقل مزاجی ، نہایت کروفر اور بڑی ہی آن بان کے ساتھ ـــ !

”غالب کا کلام ہندی مغل تمدن کی روح کا عکس پیش کرتا ہے ۔ ان کے یہاں ہمیں انسان کی عظمت کا احساس زندگی میں نئے امکانات کی تلاش کا جذبہ قوی اور معنی خیز احساسات کو اظہار بیان کی گرفت میں لانے کی کوشش اور کائنات کی دلفریب اور دلکش اشیاء سے لطف اندوز ہونے کی حرص پوری طرح نظر آتی ہے ۔“ (اسلوب احمد انصاری)

ڈاکٹر سخی احمد ہاشمی
جامعہ سند

غالب
ایک حقیقت نگار شاعر

مرزا غالب کی شاعری کو اور خصوصاً حقیقت نگاری کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے حالات کو سامنے رکھا جائے اس لیے کہ شاعر کے ماحول کا شاعری پر اثر پڑنا ضروری ہے -

غالب صرف پانچ سال کے تھے کہ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ کا انتقال ہوگیا - ان کے چچا مرزا نصراللہ بیگ نے ان کی پرورش کی ذمہ داری اپنے سر لی - ابھی کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ نصراللہ بیگ بھی اللہ کو پیارے ہوئے۔ نصراللہ بیگ کے ورثا کے اخراجات کی ذمہ داری نواب احمد بخش نے اپنے ذمہ لی جو ان کے چچا کے برادر نسبتی تھے - نصراللہ بیگ کی جائیداد کے مختار بھی نواب احمد بخش ٹھہرے تھے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا غالب کو ان کی والدہ کو مرزا کے داد و ہیال سے کچھ مالی امداد ہو جایا کرتی تھی ورنہ حقیقت میں مرزا کا نانہیال فارغ البال تھا - چنانچہ مولانا حالی لکھتے ہیں -

''مرزا عبداللہ بیگ نے بطور خانہ داماد کے اپنی تمام عمر سسرال میں بسر کی اور ان کی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی''۔ منشی شیو نرائن مالک مطبع مفید خلائق کے نام مرزا کے ایک خط سے بھی ان کے ننھیال کی دولت و ثروت کا اندازہ ہوتا ہے - مرزا لکھتے ہیں -

'' تمھارے دادا کے والد عہد نجف خان ہمدانی میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین کے رفیق تھے - جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو تمھارے پردادا نے بھی کمر کھولی اور پھر کہیں نوکری نہ کی - یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی تھیں - مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنسی دھر ، خان صاحب کے ساتھ ہیں - اور انھوں نے جو کتیھم گاؤں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا تو منشی بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں - اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں - میں اور وہ ہم عمر تھے - شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو

برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں - انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسے ہی عمر ، ان کی - باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت آدھی آدھی رات گذر جاتی تھی - چونکہ گھر آن کا بہت دور نہ تھا بس اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے - بس ہمارے اور ان کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹھرے درمیان میں تھے - ہماری بڑی حویلی وہ ہے جو اب لکھی چند سیٹھ نے مول لی ہے - اسی کے دروازہ کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اس کے ایک کھٹیا والی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس کے آگے بڑھ کر ایک کٹرہ کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا - اس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے -

مرزا کے اس خط سے کئی چیزیں سامنے آ جاتی ہیں - رئیسوں کے محلہ میں رہتے تھے - خود رئیسانہ زندگی بسر کرتے تھے - رئیسوں سے تعلقات تھے - رئیسوں کے مشاغل تھے یعنی شطرنج اور پتنگ بازی - اس میں بھی اس چیز کا خیال رکھا جاتا تھا کہ شطرنج ہو تو وہ بھی صاحب حیثیت اشخاص سے اور پتنگ لڑائی جائے تو راجہ چیت سنگھ والئی بنارس کے بیٹے راجہ بلوان سنگھ سے - ننھیال کی دولت و ثروت نے مرزا کو عیش و عشرت کی راہ پر بھی ڈال دیا ہوگا جس کا اشارہ مہر نیم روز میں ملتا ہے -

خیال کی پختگی کا زمانہ جس کا عیش میں بسر ہوا ہو اس کی شاعری کا خمیر بھی خارجی اثرات سے ہی تیار ہونا چاہیے - چنانچہ مرزا کی شاعری میں واردات قلبی ، عشق کی بے چینی اور تڑپ ، ہجر و وصال کے مضامین کی کمی محسوس ہوتی ہے - برخلاف اس کے مضامین کی جدت - فلسفہ اور تصوف کی آمیزش ، خیال کی بلندی اور ستھرائی بکثرت نظر آتی ہے - مرزا نے وہ چیزیں پیش کی ہیں - جو حقیقت پر مبنی ہیں - اور یہ چیزیں وہی پیش کرسکتا ہے جو عشق کی کیفیات سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ دنیا اور دنیا والوں کی حقیقت پر گہری نظر رکھتا ہے -

مرزا کا اگرچہ شمار رئیس زادوں میں تھا اور اس زمانہ کے رؤسا کے مشاغل میں ہی ان کی زندگی بسر ہو رہی تھی مگر ان کی تعلیم کی طرف پوری توجہ کی گئی - اس زمانہ کے مروجہ علوم کی ان کو تعلیم دی گئی چنانچہ انہوں نے منطق ، فلسفہ ، ہئیت ، طب ، عربی صرف و نحو اور علم عروض میں خاصی دستگاہ حاصل کی - فارسی کا پڑھنا شرفاً کے لیے ضروری تھا چنانچہ مولوی معظم سے فارسی پڑھی اور اہل زبان ہرمزد نامی سے اس کو مزید جلا بخشی - چنانچہ ایک خط میں مرزا لکھتے ہیں -

”میں نے ایام دبستان نشینی میں شرح مائتہ عامل تک پڑھا - بعد اس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور ، عیش و عشرت میں منہمک ہوگیا - فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری و طبعی تھا - ناگاہ ایک شخص کہ ساسان

پنجم کی نسل میں سے لہٰذا منطق و فلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومن ، موحد و صوفی صافی تھا میرے شہر میں وارد ہوا - اور لطائف فارسی بحث (خالص) اور غوامض فارسی آمیختہ بہ عربی اس سے میرے حالی ہوئے - سونا کسوٹی پر چڑھ گیا - ذہن معوج نہ تھا - زبان حدی سے پیوندازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپ عہد و بزرجمہر عصر تھا - حقیقت اس زبان کی دل نشین و عاطر نشان ہوگئی -''

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ باوجود عیش و عشرت میں زندگی بسر کرنے کے مرزا کی تعلیم و تربیت سے غفلت نہیں برتی گئی - اور یہ تعلیم و تربیت ان کی شاعری کے لیے مفید ثابت ہوئی -

مرزا کی شادی نواب احمد بخش کی بھتیجی یعنی مرزا الٰہی بخش معروف کی لڑکی سے ہوئی - یہ وہی نواب احمد بخش ہیں جو مرزا کے چچا نصراللہ بیگ کے برادر نسبتی تھے - اس نئی نسبت نے مرزا کو شعر و شاعری سے تعلق خصوصی پیدا کرا دیا اور سسرال کی جاہ و ثروت نے دنیوی اعزاز کو بڑھا دیا - مرزا الٰہی بخش معروف شاعر تھے اور ذوق کے شاگرد تھے ، اس لیے نیا ماحول مرزا کی شاعری کے لیے سازگار ہوا -

ابتدائی اشعار سے غالب کا ابتدائی رنگ جھلکتا ہے :

جگر سے ٹوٹے ہوئے موکی ہے سناں پیدا
وہاں زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط
کی تصور نے بہ صحرائے ہوس راہ غلط

کھول کر دروازۂ مے خانہ بولا مے فروش
اب شکست توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے

پروانہ کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسد
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

ان اشعار کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ غالب خیال آرائی کو زیادہ ترجیح دیتے تھے اور حقیقت نگاری کر شروع ہی سے اپنا شعار بنا رہے تھے -

داماد کا خسر کے گھر رہنا ہر زمانے میں معیوب خیال کیا جاتا رہا ہے - چونکہ مرزا کے والد خسر کے گھر رہتے تھے اس لیے یہ چیز اچھی خیال نہ کی گئی ہوگی - والد کے انتقال کے بعد مرزا کا ننھیال میں پلنا اور پڑھنا تھا تو مجبوری کی بناً پر مگر طعن کرنے والے چوکتے نہ ہوں گے - مرزا بھی جب سوچتے ہوں گے تو سبکی محسوس کرتے ہوں گے اس لیے ان کی شاعری پر بھی اس کے اثرات پڑنا لازمی معلوم ہوتے ہیں - جب کسی کو احساس کمتری ہو تو وہ کبھی کبھی دوسرے انداز میں برتری کا ظاہرہ کرتا ہے - یہ چیز قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کیونکہ بیس بائیس سال کی عمر تک ننھیال میں رہے - پھر سسرالی تعلق کی وجہ سے دہلی آ رہے - اور یہاں بھی

سرائی ثروت کے تابع رہے کیونکہ نواب احمد بخش ان کی جائیداد کے منتظم تھے اور وہ کبھی کبھی اخراجات کی زیادتی کی طرف اشارہ کرتے تھے ۔ اس لیے مرزا کا ظاہر تو دولت و ثروت کا آئینہ دار ہوگا مگر باطن میں وہ اپنے کو بے دست و پا پاتے ہوں گے اور اس احساس کو وہ دماغی کاوشوں کے لیے وسیلہ بناتے ہوں گے ۔

مرزا کو اللہ پاک نے حسین و جمیل بنایا تھا گویا ازلی طور پر وہ جمیل اور جمال پسندی کی طرف راغب تھے ۔ مرزا کی اس اعلیٰ اور بلند طبیعت نے اُن میں قرینہ اور سلیقہ پیدا کر دیا تھا اور یہی سلیقہ اُن کی شاعری میں نظر آتا ہے ۔

ان کے سلیقہ اور نفاست کا ایک ثبوت اور بھی ملتا ہے کہ انھوں نے اپنے دیوان کا انتخاب خود کیا اور ان میں سے وہ اشعار حذف کر دیئے جو زندہ رہنے کے قابل نہ تھے ۔ شاعری سے متعلق ایسا احساس بذات خود ان کی حقیقت شناسی کی نشاندہی کرتا ہے ۔

قلبی واردات کا اظہار اور عشق کی کیفیات کا پتا ڈومنی کے مرثیے سے زیادہ کس میں چل سکتا تھا جس سے مرزا کو دلی لگاؤ تھا اور اس کو بھی ان سے محبت تھی مگر یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ حقیقت نگاری کارفرما ہے ۔ غالب کے رنج و غم کا اس سے اندازہ نہیں ہوتا بلکہ دنیا کی بے ثباتی نظروں کے سامنے گھومنے لگتی ہے جس کو دنیا جانتی ہے مگر سلیقہ یا جمالیاتی ذوق یہاں بھی موجود ہے اور حقیقت کو سلیقے سے پیش کرنا انسان کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے ۔ الفاظ کی بندش ایسے قرینے سے کی ہے کہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے ۔ اور پڑھنے کے بعد خواہ مرزا کا غم اپنا غم نہ معلوم ہو مگر خوش سلیقگی کا قائل ہونا پڑتا ہے ۔

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے
عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے

عمر بھر کا کوئی پیمان وفا باندھے اور جلد ہی ساتھ چھوڑ دے تو کتنی تکلیف اور بے قراری محسوس ہوگی ۔ مگر مرزا اس بے قراری کو بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں اور زندگی کی بے ثباتی کو بیان کرتے ہیں ۔ قاری اس فکر میں ہے کہ وہ دوسرے مصرعے میں روئیں گے اور پڑھنے والے کو رلا دیں گے مگر وہ ایک حقیقت بیان کرکے چپ ہو جاتے ہیں اور قاری کو تنہا چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ دنیا کی بے ثباتی پر غور کرتا رہ جائے ۔

چونکہ زندگی محبوب کے لیے سازگار ثابت نہیں ہوئی اس لیے غالب کو زندگی زہر لگنے لگتی ہے مگر یہ کیفیت پھر بھی نہیں ہوتی کہ سینہ کوبی کریں یا بے ہوش

ہو جائیں - کہتے ہیں -

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

وہ ڈومنی بھی کتنی حیا دار تھی کہ رسوائی سے بچنے کے لیے زمین کے پردے میں چھپ گئی ورنہ شاید ابھی کچھ دن اور جیتی - ظاہر ہے کہ راز فاش ہوگیا تھا اس لیے رسوائی سے بچنے کے لیے منہ چھپانا پڑا - اور یہ منہ چھپانا اُلفت کو چھپانے کی وجہ قرار دی گئی ہے -

شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

تنہائی کی راتیں کاٹنا کتنا دشوار ہے اور پھر جس نے اپنی محبوبہ کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہو - اس کا احساس کس قدر درد انگیز ہوگا - چنانچہ میر تقی میر جنھوں نے درد غم جمع کرکے دیوان تیار کیا تھا - وہ اس کیفیت کو بیان کرتے ہیں -

جو اس شور سے میر روتا رہیگا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

یا ایک اور شعر ہے

میر یہ تیرے روز و شب کے نالے
کر دیں گے بے نمک ہی شور نوائے بلبل

ہجر کی رات کے تصور ہی سے میر کانپ جاتے ہیں اور دل کی کیفیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں :

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

غالب بھی انہی کیفیات سے دو چار رہے ہوں گے مگر وہ رونے کی گون کے نہ تھے کہتے ہیں :

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تار برشکال
ہے نظر خو کردہ اختر شماری ہائے ہائے

مہجور پیام اور محروم جمال ہونے کی وجہ سے شاعر کے دل کی کیفیت کیا ہوگی یہی نا کہ دل بیٹھا جا رہا ہوگا - اور آنکھیں امڈی آتی ہونگی - اور نا امیدی میں انسان کیا کچھ نہ کر گزرنے کے قریب ہوگا مگر غالب اس کیفیت کو اپنی بلندی میں چھپا لیتے ہیں - کہتے ہیں :

گوش مہجور پیام و چشم محروم جمال
ایک دل تس پر یہ ناامید واری ہائے ہائے

اس ہجر و یاس کی پوری غزل میں لفظ لفظ سے واردات قلبی کا ظہور ہوتا تھا۔ بے چینی و بیقراری کے اظہار کا اس سے بڑھکر اور کونسا موقع ہوتا مگر ہمیں غالب کے یہاں اس موقع پر بھی حقیقت نگاری ہی جلوہ گر نظر آتی ہے جب ولولہ و جوش کے زمانے میں ہوش کا یہ عالم ہو کہ الفاظ کو سلیقے سے پیش کرنے میں وقت لگایا گیا ہو تو بڑھاپے میں انداز بیان سرد اور بجھا بجھا سا ہونا چاہیے چنانچہ فرماتے ہیں :

کوئی امید بر نہیں آتی　　کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی　　اب کسی بات پر نہیں آتی

یا یہ شعر

رہیے اب ایسی جگہ چلکر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

غالب کے یہاں اخلاق پسندی ضرور ہے لیکن اس خصوص میں بھی ان کے یہاں حقیقت پسندی موجود ہے۔ اور سلامت کے ساتھ یہ جوہر اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردن صد دل پسند آیا
ہوائے سیر گل آئینے بے مہری قاتل
کہ انداز بخون غلطیدن بسمل پسند آیا
بے فیض بے دلی نومیدی جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدہ مشکل پسند آیا

اخلاق مضامین بکثرت ہیں مگر ان میں بھی خصوصیت موجود ہے فرماتے ہیں۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

مسافرت کی موت کس قدر بے کسی کی موت ہوتی ہے اور وہ بھی جب پریشان حالی میں ہو تو اس مصیبت کے تصور سے انسان کانپ جاتا ہے۔ ایسا شعر کس قدر درد انگیز ہو سکتا ہے مگر غالب اس تکلیف کو یہاں چھپا جاتے ہیں اور خدا کے شکر پر اکتفا کرتے ہیں :

مجھ کو دیار غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

اسی طرح تصوف کے اشعار میں بھی یہی چیز ملتی ہے ۔

ہے غیب غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
رہا اباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے
اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

عاشقانہ اشعار بھی ملتے ہیں مگر حقیقت نگاری لیے ہوئے ۔

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کے میں
شایان دست و بازو قاتل نہیں رہا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا
گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویران ہوتا
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

غالب کے مزاج میں شوخی تھی ، شاعری میں کیونکر نہ ہوتی ۔ اس شوخی میں بھی حقیقت موجود ہے کہتے ہیں ہے قیامت میں فرشتوں کے لکھے ہوئے اعمالنامے پر باز پرس ہے اس لیے لکھنے والوں میں کوئی ہمارا بھی ہونا چاہیے تھا ۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

غالب ضعیفی میں گراں گوش ہو گئے تھے ۔ اس کا اظہار کس خوبی سے کرتے ہیں :

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

چند اشعار اور ملاحظہ ہوں جن میں حقیقت نگاری کس قدر دلکشی لیے ہوئے ہے ۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی
بوئے گل ، نالۂ دل ، دود چراغ محفل
جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

عاشق کے مرنے کے بعد جتنا رنج و غم کیا جاتا وہ کم تھا مگر شاعر اس غم میں مر رہا ہے کہ مہر و وفا عاشق کے ساتھ چلی گئی، اس لیے مہر وفا کی تعزیت کرنیوالا کوئی نہیں رہا۔ شاعر کو عاشق کے مرنے کا غم بالکل نہیں ہوتا کہ اس کی تعزیت کرنیوالے تو بے شمار ہیں مہر و وفا کی تعزیت کرنے والا کوئی نہیں۔—— ایک تو غالب غم کو پاس نہیں پھٹکنے دیتے یا اگر غم میں مبتلا ہو جائیں تو اس کیفیت کو کم ظاہر کرتے ہیں۔ مگر ایک موقع ایسا بھی آتا ہے کہ دل اور جگر ان کو بہت تکلیف پہنچاتے ہیں تو نوحہ گر کی تلاش ہوتی ہے لہذا کہتے ہیں:

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

درد میں مبتلا ہو کر وہ دوا کا احسان نہیں لینا چاہتے اس لیے اپنے اچھا نہ ہونے کو اچھا سمجھتے ہیں۔

درد منت کش دوا نہ ہوا   میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

حقیقت نگاری کے کچھ اور نمونے ملاحظہ ہوں

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو
قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

قفس میں آکر ہمدم نے چمن کی بربادی بیان کر دی یہ موقع بڑا نازک تھا مگر اس پر بھی چہرا پر شکن نہیں پڑتی اور بڑی بے پروائی سے کہتے ہیں کہ وہ کسی

اور کا آشیانہ ہوگا جس پر کل بجلی گری ہے -

قید حیات و بندغم ، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

زندگی اور غم کا ساتھ کس قدر المناک ہے مگر ایک حقیقت کو بیان کرکے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ انسان اس سے چھٹکارہ پا ہی نہیں سکتا - جو شخص بھی اس دنیا میں آیا ہے اسے جانا ضرور ہے - اس مرکزی خیال کو سامنے رکھتے ہوئے غالب کا یہ شعر کتنا حقیقت سے قریب ہے -

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیوں کیجئے ہائے ہائے کیوں

غالب نے اپنے ایک خط میں اپنی عشقیہ شاعری پر خود اظہار خیال کیا ہے - فرماتے ہیں - ''عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بعد ہے جو ایماں سے کفر کو'' غالب کے اس جملہ کو پڑھ کر ان کی شاعری پر عشقیہ شاعری کا الزام لگانا گویا ان کو کافر کہنا ہے اور کفر کا فتویٰ تو کوئی مفتی ہی لگا سکتا ہے :

یہ 'تاب' یہ 'مجال' یہ طاقت نہیں مجھے

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان کے یہاں عاشقانہ اشعار ملتے ہیں تو بھی ان میں وہ کیف و مستی نہیں جو عاشقانہ اشعار میں ہونی چاہیے - حقیقت نگاری البتہ ہر جگہ نظر آتی ہے اس لیے ان کو ایک حقیقت نگار شاعر ہی کہا جائے گا -

---

''غالب کے یہاں شاعری ایک مقدس دیوانگی نہیں مہذب سنجیدگی ہے''

(آل احمد سرور)

سید قدرت نقوی

غالب نقاد فن

غالب نے جس طرح اردو نظم کو ایک توانا انداز بیان اور اردو نثر کو ایک نیا اسلوب نگارش بخشا اسی طرح علم و ادب کی جانچ پڑتال اور پرکھ کے لیے کچھ نشان راہ چھوڑے ہیں ۔ غالب کی نظر اردو اور فارسی ادب پر بہت گہری تھی ۔ اس کے اردو و فارسی خطوط و تقریظات میں اس کی ژرف نگاہی کی کافی مثالیں موجود ہیں ۔ اس نے مشاہیر اساتذہ کے کلام کا بنظر غائر مطالعہ کیا تھا ۔ اساتذہ کے کلام کو اپنے دور کے مروجہ اصول و ضوابط کی روشنی میں پرکھ کر بڑی متوازن رائے دی تھی ۔

غالب کے زمانے میں باقاعدہ تنقید کا رواج نہیں تھا لیکن تنقید موجود ضرور تھی ۔ ہر دور کی کچھ خصوصیات ہوا کرتی ہیں انہی کو سامنے رکھ کر بات کرنی پڑتی ہے ۔ غالب کے زمانے میں مشاعروں ہی میں تنقید کا فرض ادا کر دیا جاتا تھا ۔ تذکرہ نگار حضرات اپنے تذکروں میں ہر شاعر کے ذکر میں کچھ مخصوص اصطلاحی الفاظ استعمال کرکے اس کے مرتبے کو معین کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے ۔ عملی تنقید میں صرف توضیح و تشریح کا سراغ ملتا ہے ۔ اساتذہ اپنے شاگردوں کی راہنمائی کے لیے درسی کتب کی تشریح یا مشکل الفاظ کے معنی یا مشکل مقامات کی توضیح ، شرح لکھ کر فرمایا کرتے تھے ، یا حاشیہ نگاری کے ذریعہ یہ خدمت انجام دی جاتی ۔ دیباچے اور تقریظیں بھی اس سلسلے کی کڑیاں خیال کی جا سکتی ہیں ۔ جن میں زیادہ تر جذبۂ تحسین ہی کار فرما ہوتا تھا ۔ مگر کبھی کبھی ان میں بڑے کام کی باتیں لکھ دی جاتی تھیں ۔

غالب نے اردو و فارسی میں دیباچے ، تقریظیں اور خاتمے وغیرہ لکھے ہیں ۔ اردو خطوط میں بہت سے ادبی و لسانی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے ۔ یہاں صرف اردو میں بیان کردہ چند مباحث پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ـــــ دیباچہ سراج المعرفت میں مطالب کتاب پر روشنی ڈالنے کے بعد کتاب کی زبان کے متعلق لکھا ۔

''ان (اشغال و اذکار) کو ایک رسالے میں درج کریں اور اس رسالے کی تحریر میں اردو کہ صاف اور بے تکلف ہو ، خرچ کریں'' اس بیان سے ظاہر ہے کہ غالب صاف و بے تکلف

زبان کو اہمیت دیتے تھے - ان کے خطوط میں ایسی ہی زبان ملتی ہے - دیباچہ حدائق انظار میں بھی یہی بات اس طرح لکھی ہے - (خطوط غالب صفحہ ۶۳۲)

''عبارت آرائی کو ترک کیا ہے گویا تقریر کو پیرایۂ تحریر دیا ہے''

غالب نے اپنے خطوط میں اس کا دعویٰ کئی جگہ کیا ہے - مرزا حاتم علی بیگ مہر کو لکھتے ہیں (خطوط غالب صفحہ ۲۱۹)

''مرزا صاحب! میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا - ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو''

داستانوں کے متعلق نہایت وقیع خیالات کا اظہار ملتا ہے - حدائق انظار ہی کے دیباچے میں لکھتے ہیں (خطوط غالب صفحہ ۶۳۱)

''سیرو تواریخ میں وہ کچھ دیکھو جو تم سے سینکڑوں برس پہلے واقع ہوا، افسانہ و داستان میں وہ کچھ سنو کہ کبھی کسی نے نہ دیکھا نہ سنا - ہر چند خردمند بیدار مغز تواریخ کی طرف مائل ہوں گے لیکن قصہ کہانی کی ذوق بخشی و نشاط انگیزی کے بھی قائل ہوں گے - کیا تاریخ میں ممتنع الوقوع حکایات نہیں -''

آگے چل کر پھر اسی داستان و افسانہ کے متعلق کتنی اچھی باتیں بتائی ہیں -

''موعظت و پند نہیں سیرو اخبار نہیں، جھوٹا افسانہ ہے - داستاں طرازی منجملہ فنون سخن ہے، سچ یہ ہے کہ دل بہلانے کا اچھا فن ہے''

اس زمانے میں داستان و افسانہ کے متعلق یہی خیال تھا اور ان کا یہی مصرف تھا - (خطوط غالب صفحہ ۶۳۱)

مرزا رجب علی بیگ سرور کی ''فسانۂ عجائب'' مشہور کتاب ہے - ان کی ایک کتاب گلزار سرور ہے - اس کے متعلق لکھتے ہیں!

''ہاں اے صاحبان فہم وادراک! سرور سحر بیاں کا اردو نثر میں کیا پایہ ہے اور اس بزرگوار کا کلام شاہد سخن کے واسطے کیا گراں بہا پیرایہ ہے؟

رزم کی داستان گر سنیے — ہے زبان ایک تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجیے — ہے قلم ایک ابر گوہر بار

مجھ کو دعویٰ تھا کہ انداز بیان اور شوخیٔ تقریر ہیں ''فسانۂ عجائب'' بے نظیر ہے جس نے میرے دعوے کو اور ''فسانۂ عجائب'' کی یکتائی کو مٹا دیا - یہ تحریر ہے''- (خطوط غالب صفحہ ۶۳۵)

فسانۂ عجائب'' اور ''باغ و بہار'' کے متعلق غالب کی رائے تذکرۂ غوثیہ میں محفوظ ہے - وہ باغ و بہار کی زبان اور میر امن کے انداز کو اہمیت دیتے ہیں

اور فسانۂ عجائب کے فنی محاسن کی تعریف کرتے اور اسلوب نگارش کو سراہتے ہیں -

دنیا میں تقابلی تنقید کا انداز عہد قدیم سے پایا جاتا ہے - باوجود ترقی ہم آج بھی اس کو اپنائے ہوئے ہیں - غالب نے بھی تقابلی انداز کئی جگہ اپنایا ہے دیوان ذکا کے دیباچے میں اسی انداز سے کام لیتے ہوئے ذکا کا مقابلہ فارسی کے قدیم اساتذہ سے کیا ہے !

''نثر میں نعمت خان حالی کی طرز کا احیا کیا ہے - مگر پیرایہ کچھ اس سے بہتر دیا ہے - قصائد میں انوری کا چربہ اٹھایا ہے ، مگر طبیعت نے اچھا زور دکھایا ہے غزل میں متاخرین کا انداز ، عاشقانہ سوزو گداز'' (خطوط غالب صفحہ ٦٣٦)

تذکیر و تانیث کا مسئلہ اردو میں بڑا نازک مسئلہ ہے - غالب نے متعدد خطوط میں اسی مسئلے پر اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں - مولوی سید فرزند احمد نے رسالہ'' تذکیر و تانیث لکھا تھا - غالب نے اس کا دیباچہ لکھا ہے - اس میں لکھتے ہیں ! (خطوط غالب صفحہ ٣٦٧)

''سبحان اللہ ! تذکیر و تانیث کی تقریر کہ وہ اور مطالب کی توضیح پر بھی مشتمل ہے اس لطف سے ادا ہوئی - ہر چند اس راہ سے کہ دانا اور دقیقہ رس اور منصف ہیں ، قواعد تذکیر و تانیث کے منضبط نہ ہونے کے خود متعرف ہیں لیکن قوت علم و حسن - فہم و لطف سے وہ مضبوط ضوابط بہم پہنچائے ہیں کہ اور صاحبوں کے دل کی دوسرے کو کیا خبر ؟ مگر مجھے تو دل سے پسند آئے ہیں -''

سچ یہ ہے کہ آج تک اردو میں تذکیر و تانیث کے لیے ٹھوس قاعدے نہ بن سکے اس مسئلہ میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے - خاتمۂ ''شعاع مہر'' مصنفہ مرزا حاتم علی بیگ مہر میں نظم کے متعلق نہایت عمدہ رائے دی ہے - (خطوط غالب صفحہ ٢٨٣)

''سخن ایک معشوقۂ پری پیکر ہے - تقطیع شعر اس کا لباس اور مضامین اس کا زیور ہے - دیدہ وروں نے شاہد سخن کو اس لباس اور اس زیور میں رو کش ماہ تمام پایا ہے -''

گویا غالب نے کلام میں وزن اور مضامین کو اہمیت دی ہے - لیکن دیباچہ دیوان میں الفاظ و معنی پر زور دیا ہے : (خطوط غالب صفحہ ٦٣٩)

''اس سحر کار جادو نگار نے پری زادان معنی کو الفاظ کے شیشوں میں اس طرح اتارا ہے جیسے آبگینہ مے سے مے نظر آئے ، لفظ سے جلوۂ معنی آشکارا ہے -''

نکات ورقعات کے آغاز میں کتنا اہم بیان ہے ایسا بیان غالب سے پہلے اور کسی کا نہیں ملتا - (خطوط غالب صفحہ ٦٤١)

''اردو آگے مرکب تھا عربی ، فارسی ، ہندی اور ترکی ، ان چاروں زبانوں سے - اب پانچویں زبان انگریزی بھی اس میں شامل ہو گئی - دیکھو گنجائش اردو کی کہ یہ پانچویں زبان کی کس لطف سے حاوی ہوئی اور یہ زبانیں اس میں کس طرح سما گئی ہیں کہ کوئی زبان اوپری نہیں معلوم ہوتی -''

ادب میں ایک اصطلاح ہے ''سہل ممتنع'' - جس کو عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ کلام جو دیکھنے میں آسان ہو لیکن سمجھنے میں مشکل آ پڑے - یہ خیال غلط ہے - دراصل ''سہل ممتنع'' وہ کلام ہے جو دیکھنے میں آسان ہو لیکن جب اس جیسا کہنے یا لکھنے بیٹھیں تو ویسا نہ لکھ سکیں - غالب نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے اور اس کا صحیح مفہوم بتایا ہے - ''سہل ممتنع'' میں کسرۂ توصیفی ہے - سہل ، موصوف اور ممتنع صفت - اگرچہ بحسب ضرورت کسرۂ لام ہو سکتا ہے لیکن مخل وضاحت ہے - اور لام موقوف تو خود سراسر قباحت ہے - ''سہل ممتنع'' اس نظم و نثر کو کہتے ہیں کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اس کا جواب نہ ہو سکے - بالجملہ سہل ممتنع کمال حسن کلام ہے اور بلاغت کی نہایت ہے - ممتنع در حقیقت ممتنع النظیر ہے - شیخ سعدی کے بیشتر فقرے اس صفت پر مشتمل ہیں اور رشید و طواط وغیرہ شعرائے سلف نظم میں اس شیوے کی رعایت منظور رکھتے ہیں - خود ستائی ہوتی ہے - سخن فہم اگر غور کرے گا تو فقیر کی نظم و نثر میں سہل ممتنع اکثر پائے گا ''

ہے سہل ممتنع یہ کلام ادق مرا
برسوں پڑھے تو یاد نہ ہووے سبق مرا

یہ مصرع (شعر) حیرت آور ہے - ''کلام ادق -'' سہل ممتنع کے منافی ہے پھر یاد نہ ہونا اور حافظے پر نہ چڑھنا سہل ممتنع کی صفت نہیں ہو سکتی ''کلام ادق جس کا حفظ دشوار ہو ، شاید کوئی قسم اقسام کلام میں سے ہو - ہاں کلام ادق کلام مغلق '' کو کہتے ہیں سو کلام مغلق اور سہل ممتنع -

مغلق اور ادق سہل ممتنع اور سہل ممتنع مغلق اور ادق کیوں کر ہو سکے گا اور حافظے میں محفوظ نہ رہنا کلام مغلق وادق کی صفت کیوں کر پڑے گی ؟ ہاں مغلق عسیرالفہم ہوگا ، پڑھا نہ جائے گا ، معنی سمجھ میں نہ آئیں گے - سہل ممتنع کی صفت وہ تھی جو فقیر اوپر لکھ آیا - اس شعر سے اسے کچھ علاقہ نہیں -''

(خطوط غالب صفحہ ۳۴۵)

حاصل کلام یہ ہے کہ سہل ممتنع اور مشکل و پیچیدہ کلام ایک دوسرے کی ضد ہے - سہل ممتنع پڑھنے اور سمجھنے میں آسان ، اس کا مثل مشکل - دقیق و مغلق - پڑھنے اور سمجھنے میں مشکل اس کا مثل ممکن اور آسان -

اردو نثر و نظم میں فارسی اسالیب بیان کا پرتو اور تقلید ملتی ہے ۔ نثر کے تین اسلوب فارسی میں ہیں ۔ اس کے تتبع میں ابتداً اردو میں بھی نثر کی وہی تین قسمیں کی گئیں ۔ غالب نے اقسام نثر پر اچھی روشنی ڈالی ہے ۔ یہ امور اس لئے بھی اہم ہیں اور قابل غور کہ آج بھی اچھے پڑھے لکھے ان اقسام کا کما حقہ علم نہیں رکھتے اور ان میں امتیاز کرنے سے قاصر رہتے ہیں ۔

نثر کے متعلق بحث پیش کرنے سے قبل کچھ باتیں عرض کر دوں ، کہ نثر سادہ اور عاری یہی ہے جو عام طور پر آج کل لکھی جا رہی ہے ۔ نثر حقیقی وہ نثر ہے جس کے فقرے اور جملے ہم قافیہ ہوں ۔ اس اعلیٰ قسم مسجع ہے کہ فقرتین کے الفاظ ہم وزن ہوں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک لفظ پہلے جملے میں جس حیثیت و وزن کا ہو دوسرے جملے میں بھی الفاظ اسی حیثیت و وزن کے مطابق ہوں ۔ مثلاً ۔ ''عزم مقابلہ نہیں ۔ قصد مجادلہ نہیں ۔ مسائل حکیمانہ کی ہستی ، ترہات قدیمانہ کی مستی ۔ رد و قبول کی حکایت ۔ فتح و شکست کی روایت'' یہ سب مسجع ہیں ۔ کہ فقرتین کے الفاظ ہم وزن ہیں یعنی حرکات میں برابر ہیں ۔ یہ وزن شعر نہیں ہے ۔ شعر میں یہ صنعت آ پڑے تو وہ مرصع ہے ۔ مثلاً غالب :

ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

یا میرا شعر ہے !

نالہ احساس کے صحرا کی صدا ہوتا ہے
اشک جذبات کے طوفاں کی ضیا ہوتا ہے

نثر کے لئے لفظ مرصع استعمال کرنا غلط ہے مگر اس غلطی کا ارتکاب اچھے اچھوں سے ہوا ہے ، مرجز وہ نثر ہے جو کسی مقررہ وزن شعر میں لکھی گئی ہو ۔ اس کے فقروں میں قافیہ نہ ہو ۔ قافیہ ہوگا تو اسے نظم کہیں گے ، نثر نہیں ۔ مثلاً ''بھائی صاحب ! سلام ہو تم پر ، خوش تو ہے آپ کا مزاج شریف ۔'' لیکن اسے صرف فارسی و عربی میں نثر کا درجہ دیا جاتا ہے ۔ اردو میں یہ نثر نہیں پائی جاتی ، کیونکہ ہمارے ادب میں ایک صنف سخن نظم معریٰ ہے ، جس کے اشعار میں قافیہ کی پابندی نہیں کی جاتی ، گویا عربی و فارسی کی نثر مرجز اردو میں نظم معریٰ بن گئی ہے ۔ اب غالب کے خیالات ملاحظہ فرمائیے ۔

''نثر عاری ، نہ قافیہ نہ وزن ۔ نثر مسجع قافیہ موجود وزن مفقود مگر اس میں ترجیح کی رعایت ضرور ہے یعنی فقرے میں کے الفاظ مماثل اور ملائم ہم دگر ہوں اور اگر یہ بات نہ ہو گی اور صرف قافیہ ہوگا تو اس کو مقفیٰ کہیں گے نہ مسجع ۔ نثر مرجز وہ ہے کہ وزن ہو اور قافیہ نہ ہو ۔'' (خطوط غالب ۴۲۵)

پھر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں ''بندہ کی تحقیقات یہی ہے کہ نثر تین قسم پر ہے ۔ مقفیٰ ، قافیہ ہے وزن نہیں ۔ مرجز ، وزن ہے اور قافیہ نہیں ۔ عاری نہ وزن ہے اور نہ قافیہ ۔ مسجع ہی مقفیٰ ہے کہ دونوں فقروں میں الفاظ ملائم اور مناسب ہمدگر ہوں ۔ نظم میں یہ صفت آ پڑے تو اس کو مرصع کہتے ہیں اور نثر اس صفت پر مشتمل ہو تو اس کو مسجع کہتے ہیں ۔'' (خطوط غالب صفحہ ۴۷۸)

اس بحث کے آخر میں غالب کا وہ بیان پیش کیا جا رہا ہے جس میں مشہور لغت نگاروں کی ظاہر راکت کی گئی ہے کہ ان لوگوں نے نہ مسجع کو سمجھا ہے اور نہ مرجز کو یہ بیان ذرا طویل ضرور ہے مگر افادیت سے خالی نہیں ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہو جائیگا کہ غالب کتنا مظلوم رہا ہے کہ اس کی صحیح اور درست بات کو بھی تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے۔

''نثر مرجز کے باب میں پیر و مرشد کو اتنا تامل کیوں ہے ؟ یہ جو نثریں آپ نے لکھی ہیں سوائے اس نثر کے کہ جس کو آگے لکھوں گا ، یہ تو سب مسجع ہیں ۔ یعنی پہلے فقرے کا ہر لفظ وزن میں موافق ہے ، دوسرے فقرے کے لفظ سے نظم میں یہ صنعت آ پڑے تو نظم کو مرصع کہیں گے اور نثر میں واقع ہو تو نثر کو مسجع کہیں گے جو حضرت کہ اس نثر کو مرجز کہتے ہیں وہ نثر مسجع کی مثال ہم کو دیں ۔ زنہار ، زنہار یہ نثر مرجز نہیں مسجع ہے ۔ ہاں یہ نثر مرجز ہے ''صاحبا مشفقا شفیق دلی زید الطافکم الی الابد ، بعد تبلیغ بندگی و نیاز برضمیر منیر روشن باد''

اگروہ نثر کہ جس کو میں نے مسجع کہا ہے ، مرجز ہے تو اس کم بخت نثر کا کیا مقام ہے ؟ نہیں وہ مسجع ہے اور یہ مرجز ہے ۔ میں تو بہت مختصر و مفید لکھ چکا ہوں آپ نہ مانیں تو کیا کروں ؟ وزن ہو قافیہ ہو وہ مقفی ۔ وزن ہو قافیہ نہ ہو وہ مرجز ہے ۔ الفاظ و فقر تین وزن میں برابر ہوں وہ مسجع ہے۔ اس صنعت کو بیشتر نثر مقفیٰ میں صرف کرتے ہیں اور چاہو قافیہ کا التزام نہ کرو یہ ہر رنگ اقسام ثلاثہ نثر ہی ہے ۔ حضرت نے نثر مسجع کو مرجز کہا ہے جواب وہی ہے کہ اگر مرجز یہ ہے تو مسجع کس نثر کو کہتے ہیں ؟ اس سے زیادہ نہ مجھ کو علم نہ یارائے کلام''۔

قتیل لکھنوی اور غیاث الدین ملائے مکتبی رامپوری کی قسمت کہاں سے لاؤں ؟ ؟ کہ تم جیسا شخص میرا معتقد ہوا اور میرے قول کو معتمد سمجھے ۔ بعد اتمام خط کی تحریر کے ، خیال آیا کہ شاید کسی بات کا جواب نہ رہ گیا ہو ، میں نے آپ کے خط کو دیکھا اور ایک بات دستور شگرف کی عبارت میں نظر آئی :

''مرجز کلامیست منشور کہ وزن دارد ، سجع نہ دارد''

اس تعریف کو دیکھیے اور نمونہ موزوں نثر کو دیکھیے وہ موزوں کہاں ہے ؟ جو وزن دارد اس پر صادق آئے ؟ وزن بمعنی تقطیع شعر مفقود ۔ ''سجع ندارد'' خدا جانے یہ بزرگ

سجع پر کس کو کہتا ہے ؟ سجع ہم وزن ہونا دو لفظوں کا فقرتین میں مصرعین میں ، سواس نثر میں موجود ہے - موجود کو مفقود اور مفقود کو موجود لکھا ہے اور پھر کلام اس کا مقبول ہے ! اللہ اللہ ! ملا غیاث الدین لکھتا ہے :

''مرجز نثرے باشد کہ کلمات فقر تین اکثر جابجا موزون باشد ، درتقابل یک دیگر ، بدون رعایت سجع'' خدا کے واسطے مسجع تو اسی کو کہتے ہیں کہ کلمات فقرتین یا مصرعین ہم وزن یک دیگر ہوں ، سواس نثر میں موجود ''بدون رعایت سجع'' کے کیا معنی ؟ مگر یہ دونوں صاحب ، وزن کو برابر ہونا کلمات کا سمجھتے ہیں اور سجع تقطیع شعر کو کہتے اس عقیدے کی رکاکت اظہرمن الشمس ہے - صاحب ''دستور شگرف'' کا کلام نص اور مولوی غیاث الدین کا کلام حدیث نہیں ہے - آپ بھی غور فرمائیے اور انصاف کیجیے! (خطوط غالب صفحہ ۳۸۱ و صفحہ ۳۸۲)

غالب کی نظر حقیقت الفاظ پر بڑی گہری تھی وہ اس الفاظ کی حقیقت ، ان کے معنی اور محل استعمال سے بڑی اچھی واقفیت رکھتے تھے یہ صفت ان کے معاصرین میں مفقود تھی ، یوں تو بطور مثال چند لفظوں کے متعلق غالب کی معلومات پیش کی جاتی ہیں۔ ندامت و خجالت کا فرق اس طرح بیان کرتے ہیں :

''ندامت فعل پر مترتب ہوا کرتی ہے - ترجمہ اس کا پشیمانی - حضرت یوسف کو ندامت کیوں ہو ؟ مگر خجالت اس کا ترجمہ ہے شرمندگی - آپ غور کیجیے کہ ندامت و خجالت میں کتنا فرق ہے ؟ جہاں آپ نے ''عرق ریز ندامت'' لکھا وہ محل ''خجالت کا تھا - آپ نے ندامت کیوں لکھا ؟'' (صفحہ ۳۸۸)

اب آپ لفظ 'تیار' کی حقیقت غالب کے قلم سے ملاخطہ فرمائیے -

'طیار' صیغہ مبالغہ کا ہے لغت عربی اس کی طائے حطی سے 'طیر' ثلاثی مجرد 'طائر' فاعل 'طیور' جمع - بازداروں میں اس لفظنے جنم لیا حقیقت بدل گئی طوئے تے بن گئی، یعنی جب کوئی شکاری جانور شکار کرنے لگا - بازداروں نے بادشاہ سے عرض کی 'فلاں باز' فلاں شکرہ ''طیار'' شدہ است ، صید می گیرد ، بہر حال اب تائے قرشت سے یہ لفظ نیا نکل آیا ، اسی لفظ کو مستحدث اور دراصل اردو یہ تائے قرشت اور بمعنی آمادہ ، اشخاص واشیاء عالم پر عام تصور کرنا چاہیے ، اور عبارت فارسی میں اس کا استعمال کبھی جائز نہ ہوگا - خطوط غالب صفحہ ۴۴۳

صاحب فرہنگ نظام نے بھی 'تیار' کو اردو لفظ بتایا ہے - انہوں نے اس لفظ کے دخول و نفوذ و ور ود کے متعلق یہی لکھا ہے کہ یہ ہندوستان سے آیا ہے -

اردو فارسی میں 'تیار' کے استعمال کو منع لکھا ہے ، اور 'طیار' لکھنے کی ہدایت کی ہے ، مگرمیرے نزدیک اردو میں 'تیار' ہی درست ہے کیونکہ یہ اردو کا تصرف ہے، اس سے اردو کی انفرادیت قائم و برقرار ہوتی ہے - غالب نے جتنی وضاحت بیان کی ہے صاحب فرہنگ نظام اتنی بھی نہ کر سکے -

غالب نے اپنے شاگردوں کے استفسار پر دیگر اساتذہ کے اشعار کی شرح بھی لکھی ہے ، اور اپنے شعروں کے معانی بھی بیان کیے ہیں - ہم یہاں ان کے مشہور شعروں کی شرح پیش کرتے ہیں لیکن یہاں یہ امر ذہن نشین رہے کہ غالب نے مکمل شرح نہیں لکھی بلکہ مکتوب الیہ کے مبلغ علم کے پیش نظر اشارے کر دیے ہیں تاکہ تفہیم شعر میں آسانی ہو ، مطلع دیوان ہی کی شرح ملاحظہ فرمائیے -

''نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا؟

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے جیسے مشعل دن کو جلانا ، یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا - بس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخی تحریر کا فریادی ہے ؟ کہ جو صورت تصویر ہے اس کا پیرہن کاغذی ہے یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر ، اعتبار محض ہو ، موجب ملال و آزاد ہے -'' (خطوط غالب صفحہ ۲۳۴)

غالب نے یہاں انتہائی اختصار سے کام لے کر صرف تلمیح ''کاغذی پیرہن'' کی تشریح کر دی ہے - نفس مضمون پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی ، اس لیے ذرا سی وضاحت ضروری ہے - یہ شعر حمد میں ہے مگر ایک طنز کا پہلو لیے ہوئے ہے ، نقش یعنی مخلوق انسان ، کائنات ، وغیرہ ایک نقش کی مانند ہیں ، جن میں عمل حسن کاری بدرجہ اتم پایا جاتا ہے - اس نقش کو بھی اپنے حسن و جمال کا احساس ہے - ساتھ ہی اس کو فنا ہونے کا بھی یقین ہے - اس حسن اور فنا کے احساس وایقان نے اس کو درگاہ الٰہی میں فریادی کی صورت میں پیش ہونے کی ترغیب دی ، یا جرأت بخشی تاکہ درگاہ الٰہی میں وہ فریاد کرے کہ اے خالق اکبر تو نے مجھے حسن و جمال بخشا ہے تو بقائے دوام سے کیوں محروم رکھا ہے ؟ نقش ، حسن اور ناپائیداری کی علامت ہے ، شوخی تحریر ، نقاشی کے عمل سے حسن و جاذبیت پیدا ہونے کی طرف اشارہ ہے ، پیکر تصویر بھی حسن ناپائیدار کے لئے استعمال ہوا ہے - کاغذی پیرہن ، فریادی کی وہ ہیت جس سے وہ پہچانا جاتا ہے ، اور مظلوم کی نمائندگی کرتا ہے ، اسی لیے غالب نے ہستی کو موجب رنج و ملال و آزار کہا ہے - ایک اور شعر کی شرح ملاحظہ فرمائیے : !

''پیر و مرشد !

اک شمع ہے دلیل سحر ، سو خموش ہے

یہ خبر ہے پہلا مصرع -

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے

یہ مبتدا ہے شب غم کا جوش ، یعنی اندھیر ہی اندھیرا ، ظلمت غلیظ ، سحر ناپید گویا خلق ہی نہیں ہوئی ، ہاں دلیل ، صبح کی بود پر ہے ، بجھی ہوئی شمع

اس راہ سے کہ شمع و چراغ ، صبح کو بجھ جایا کرتے ہیں ، لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیل صبح ٹھہرایا ، وہ خود ایک سبب ہے ، منجملہ اسباب تاریکی کے ، پس دیکھنا چاہیے جس گھر میں علامت صبح ، نوید ظلمت ہوگی ، وہ گور کتنا تاریک ہوگا۔،، (خطوط غالب صفحہ ۵۳۵)

اب ایک اور شعر کی شرح ملاحظہ کیجیے جس میں ذرا تفصیل سے کام لیا گیا ہے -

حسن، اور اس پہ حسن ظن ، رہگئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے ، غیر کو آزمائے کیوں ؟

''مولوی صاحب ! کیا لطیف معنی ہیں ؟ داد دینا ! حسن عارض اور حسن ظن، دو صفتیں محبوب میں جمع ہیں یعنی صورت اچھی ہے گمان اس کا صحیح ، کبھی خطا نہیں کرتا اور یہ گمان اس کو بہ نسبت اپنے ہے، کہ میرامارا کبھی نہیں بچتا اور میرا تیر غمزہ خطا نہیں کرتا پس جب اسکو اپنے اوپر بھروسا ہے تو رقیب کا امتحان کیوں کر ہے ؟ حسن ظن نے رقیب کی شرم رکھ لی، ورنہ یہاں معشوق نے مغالطہ کھایا تھا، رقیب عاشق صادق نہ تھا ہوسناک آدمی تھا ، اگر پائے امتحان درمیان آتا تو حقیقت کھل جاتی۔،، (خطوط غالب ۵۲۳)

اس طرح کے مباحث بہت سے خطوط میں ہیں، محاسن کے علاوہ نقائص بھی بیان کیے ہیں ، اپنے ایک شاگرد کے شعر کے متعلق لکھتے ہیں - (صفحہ ۵۳۰)

''ہیں اپنے گناہ،، مزہل امید ایمان کہاں ہے ایک ڈر

اس شعر میں مقصد اچھا ہے ، مگر بیان ناقص ہے - مطلب تو یہ ہے کہ صرف خوف اصل ایمان نہیں، رجا کا بھی شمول چاہیے، اور یہ بات اس تقریر میں سے نکلتی نہیں۔،، یعنی شعر میں ابلاغ و اظہار کی کوتاہی ہے ، جسے غالب نے اپنے دور کی اصطلاح میں ''ناقص بیان،، کہا ہے - علی حزین فارسی کا ایک بلند پایۂ شاعر ہے ، غالب اس کو بہت بلند مرتبہ دیتے ہیں لیکن جب کلام پر کھنے کا موقع آتا ہے تو اس کے معمولی عیب کو عیب ہی قرار دیتے ہیں، اور پیروی کرنے سے منع کرتے ہیں :

''ز ترک تازیٔ آں نازنین سوار ہنوز
ز سبزہ می دمد انگشت زینہار ہنوز

حزین کے اس مطلع میں واقعی ایک ''ہنوز،، زائد اور بیہودہ ہے ، متبع کے واسطے سند نہیں ہو سکتا، یہ غلط محض ہے، یہ سقم ہے یہ عیب ہے اس کی کون پیروی کرے گا؟ حزین تو آدمی تھا، یہ مطلع اگر جبریل کا ہو تو اس کو سند نہ جانو اور اس کی پیروی نہ کرو۔،، (خطوط غالب صفحہ ۲۳۹)

غالب کے تنقیدی شعور کے جو ہر فارسی کے مشہور لغت ''برہان قاطع'' کی غلطیاں نکالنے میں کھلتے ہیں۔ غالب کے عہد ہی میں نہیں ، بلکہ اب، تک فارسی کے جن چند لغات کو مستند مانا جاتا ہے ، ان میں 'برہان قاطع' کو اچھی خاصی اہمیت حاصل ہے ، یہ لغت اب بھی پاک و ہند اور ایران میں مستند تسلیم کیا جاتا ہے ، غالب نے اس کی غلطیاں نکال کر ایک کتاب میں جمع کیں اور 'قاطع برہان' نام رکھا ، کچھ اور کا اضافہ کرکے دوبارہ چھپوایا تو ''درفش کاویانی'' نام دیا ۔ اس کتاب کی تردید و تائید میں کئی کتابیں لکھی گئیں ، غالب کی مخالفت اس گروہ نے کی جو کورانہ تقلید کا قائل تھا ۔ پورے ہندوستان میں اس کتاب نے تہلکہ مچا دیا تھا ۔ غالب نے استہزائیہ انداز اختیار کیا تھا ، اس لیے مخالفین نے دشنام طرازی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی ، حتٰی کہ غالب کو ہتک عزت کا دعوئ دائر کرنا پڑا ، مگر مقلدان کور نظر نے غالب کی جائز باتوں کو بھی غلط قرار دیا اور مخالفت میں گواہی دی ۔

''قاطع برہان'' کی افادیت سے قطع نظر ، صرف غالب کا یہ کارنامہ ہی بہت بڑا ہے کہ اس نے کورانہ تقلید کے خلاف آواز بلند کی اور خود سوچنے سمجھنے کی دعوت دے کر ایک نئے شعور کو جنم دیا ۔

''یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو کچھ کہہ گئے ہیں وہ حق ہے ، کیا اس وقت آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے''۔
(غالب)

پروفیسر محمد منور

غالب مغلوب

بر عظیم پاک بھارت کے فلک بوس قصر ادب میں دو شیش محل ہیں ۔ اقبال اور غالب ــ دونوں کی بیشتر شہرت شعری آئینہ کاری کے باعث ہے ۔ان پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی بدولت ملک کے ادبی خزینوں میں وسیع اضافہ ہوا ہے ۔ اس اعتبار سے اب ان دونوں میں سے کسی پر بھی قلم اٹھانا بڑی ذمہ داری یا ممکن ہے غیر ذمہ داری کی بات ہو ۔ تا ہم عذر کے لیے گنجائش موجود ہے ، وہ یہ کہ بقول حالی

نیا ہے لیجئے جب نام اس کا بڑی وسعت ہے میری داستاں میں

غالب کا شعر بھی سن لیجئے

صد سال میتواں سخن از زلف یار گفت
در بند ایں مباش کہ مضموں نماندہ است

محبت کے قصے اور داستانیں باسی نہیں ہوتیں کان ہر بار نئی لذت محسوس کرتے ہیں ۔ جن کے مناظر کی دلکشی کو تکرار کے باوصف قرار حاصل ہے ۔ وہی چاند بار بار طلوع ہوتا چلا آ رہا ہے ۔ وہی بہاریں ہیں بار بار روپ دکھاتی آ رہی ہیں ، نہ چاند کی دل آویزی کو تکرار نے کم کیا ، نہ بہار کی ساحری کو ــ اس اعتبار سے غالب کا تذکرہ بھی ایک دلچسپ داستان اور ایک حسین منظر ہے ، اس داستان کی ساعت اور اس جشن کا نظارہ جب بھی میسر ہو لطف آ جاتا ہے ، اس حوصلے پر غالب کے بارے میں کچھ کہنے کی جرات کر رہا ہوں ۔

میں نے اس تحریر کا عنوان غالب مغلوب کیا ہے ۔ یہ ترکیب خود غالب ہی کی طبع اختراع پسند کی ساختہ پرداختہ ہے ۔ مثلاً ناسخ کے نام ایک فارسی خط

میں انہوں نے لکھا ، یکے از ستمگراں خدا ناترس کہ بعذاب ابدی گرفتار باد ولیم فریزر صاحب بہادر را کہ ریزیڈینٹ دہلی و غالب مغلوب را مربی بود دو شب تاریک بضرب تفنگ کشت و مرا غم مرگ پدر تازہ کرد۔

اس ترکیب میں ذہن میں غالب کی کشمکش حیات کی عبرتناک فلم پھیلا دی — ولیم فریزر علم دوست انگریز تھا،مگر غالب کا یارانہ محض اس کی علم دوستی پر مبنی نہ تھا غالب کی پنشن کا مقدمہ چل رہا تھا۔وہ مقدمہ جس نے غالب کی زندگی کو جہنم بنا دیا ولیم فریزر سے امداد کی توقع تھی ۔ اس کے قتل سے مایوسی کا دامن اور وسیع ہو گیا ، ۔ مگر غالب کی حالات کے ہاتھوں مغلوبیت کا عالم یہ ہے کہ وہ فریزر کی موت کو مرگ پدر سے تشبیہ دے رہے ہیں،، ۔

آج کے ماحول میں یہ انگریز دوستی عجیب سی معلوم ہو گی لیکن غالب کی مجبوری یہ تھی کہ ان کی ظاہری وجاہت بڑی حد تک انگریز کی خوشنودی پر منحصر تھی ۔ اور انہیں اس امر پر فخر بھی تھا ۔ آپ کو یاد ہو گا کہ انہوں نے طبیعت کے ہاتھوں مغلوب ہو کر برہان قاطع کے مصنف پر ایسی طنز و تعریض کی تھی کہ جواباً ایک طوفان دشنام اٹھ کھڑا ہوا ۔ اس طوفان کی ایک موج شدید موید برہان تھی ۔ جس کے مصنف مرزا احمد علی تھے ۔ مرزا احمد علی نے بھی دشنام کا حصہ رسد مہیا کیا تھا ۔ غالب اپنی ایک جوابی کتاب تیغ تیز میں ان کی نسبت لکھتے ہیں ''جتنے الفاظ تذلیل کے ہیں۔وہ چن چن کر میرے واسطے استعمال کئے اور یہ نہ سمجھا کہ غالب اگر عالم نہیں ، شاعر نہیں ۔ آخر شرافت و امارت میں ایک پایہ رکھتا ہے ۔ صاحب عز و شان ہے ۔ عالی خاندان ہے ۔ امرائے ہند روسائے ہند ، راجگان ہند سب اس کو جانتے ہیں ۔ رئیس زادگان سرکار انگریزی میں گنا جاتا ہے ۔ بادشاہ کی طرف سے نجم الدولہ کا خطاب ہے ۔ گورنمنٹ کے دفتر میں خانصاحب بسیار مہرباں دوستاں القاب ہے ۔ جس کو گورنمنٹ خانصاحب لکھتی ہے ۔،،

یہ برہان قاطع کا ہنگامہ مرزا غالب کا اپنا پیدا کردہ تھا ۔ انگریزی مقولے کے مطابق انہوں نے بگولے بیج کر آندھی کی فصل اٹھائی تھی ۔

مگر فی الحال توجہ اس پر رہے کہ غالب کو ''یکے از رئیس زادگان انگریزی،، ہونے میں فخر محسوس ہوتا ہے ۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ۔ یہ بھی حالات کی عطا کردہ مجبوری تھی ۔

غالب کے دارا قوقان بیگ خاں اپنے والد بزرگوار ترسم خاں سے ناراض ہو کر ہندوستان چلے آئے تھے — آپ کو یاد ہو گا ظہیر الدین بابر بادشاہ نے ہندوستان فتح

کرنے کے بعد اپنے مولد و مرز بوم یعنی ارض سمر قند و فرغانہ کی طرف دعوت عام روانہ کی تھی کہ جو جو مرزا صاحبان آئیں گے ، زر منصب اور جاگیر پائیں گے ۔ چنانچہ تورانی امرا وقتاً فوقتاً بر عظیم پاک ہند کی جانب رخ کرتے رہے ۔ توقان بیگ کی بد قسمتی کہ وہ اس وقت آئے جب مغلیہ قافلہ اقتدار نگاہوں سے اوجھل ہو رہا تھا ۔ قافلہ کم دکھائی دیتا تھا اور غبار زیادہ ۔ محمد شاہ کا دور آخر ہو گا ، کئی سال نظامت لاہور میں قیام رہا ۔ جب دلی وارد ہوئے تو شاہ عالم ثانی کا زمانہ تھا ۔ جن کی حکومت آخر ''از دہلی تا پالم'' رہ گئی تھی ۔ شاہ عالم نے بہر حال جاگیر سے نوازہ توقان بیگ کے دو فرزند تھے ۔ نصراللہ بیگ خاں اور عبداللہ بیگ خاں توقان بیگ کی طرح یہ دونوں بھی مہم پسند اور شمشیر فروش تھے ۔ شمشیر فروش اس طرح کہ بازار جہاں میں ان کا زر مبادلہ شمشیر ہی تھا ۔ توران سے یہ لوگ شمشیر کے بھروسے پر نکلے تھے جب یہاں شمشیر خریدنے والی مرکزی قوت ٹوٹ گئی تو پھر جس نے بھی خریدنا چاہا پا لیا ۔ ایسے عالم میں وفاداریوں کا جنجھٹ پیدا نہیں ہوتا ۔ نصراللہ بیگ خاں نے مرہٹوں کی ملازمت میں اکبر آباد (آگرہ) کی حکومت بھی سنبھالی ۔ یہ عرصہ یقیناً محدود ہو گا پھر انگریزی فوج میں رسالدار ہو گئے اور جاگیر پائی ۔ عبداللہ بیگ خاں کبھی لکھنو میں آصف الدولہ کے یہاں رہے کبھی حیدرآباد میں کبھی جے پور میں اور آخر مہاراجہ الور کی خدمت‌گزاری میں مارے گئے نہ مسلمانوں کا قومی اجتماعی شعور بیدار تھا نہ ہندوؤں ، قسمت آزمائی کا زمانہ تھا ۔ جدھر حالات بہتر نظر آتے سپاہی منش شمشیر زادے ادھر کو ہو جاتے تھے ۔

اپنے والد کی وفات کے وقت غالب پانچ برس کے ہونگے ۔ چچا متولی تھے ، جنہوں نے اپنی وفاداری انگریز سے وابستہ کردی ۔ چنانچہ انگریز کی عطا کردہ جاگیر سے ان کے ورثا متمتع ہوتے رہے ۔ انہی میں غالب بھی تھے ۔ ظاہر ہے کہ جب غالب نے آنکھ کھولی تو جو امارت ، جاگیر یا اعتبارو وقار میسر تھا وہ زیادہ تر انگریز کے باعث تھا ۔ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ کا رسمی احترام بجا ، اس مٹتی ہوئی شان کے ساتھ بھی ظاہری رابطہ میں ایک طرح کی شان تھی ۔ لہذا اس شان کو حاصل کرنے کی بھی مرزا غالب بڑی بے قراری سے کوشش کرتے رہے اور بڑی لجاجتوں اور زاریوں کے بعد جو انکے کئی قصائد سے عیاں ہو رہی ہے ان کا ۱۸۵۰ء میں بہادر شاہ کے دربار سے بھی با ضابطہ تعلق قائم ہو گیا ۔ تا ہم انگریز کے نمک خوار وہ پانچ برس کی عمر سے تھے ۔ بہادر شاہ سے تنخواہ ۵۳ برس کی عمر میں پانے لگے ۔ مزاج میں آبائی سپاہی منشی رچی تھی ، چنانچہ وفاداری کے اصولاً شدت سے قائل ہونے کے باوصف زیادہ قائل نہ تھے ۔ وفاداری بشرط استواری کا دعویٰ

ایک طرف مگر دوسری طرف حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں "محبت میں شکر کی مکھی بنو شہد کی مکھی نہ بنو"، ان کی بیشتر وفاداری خاندانی وجاہت سے تھی اور کسی نہ کسی طرح اپنے ظاہری وقار کو قائم رکھنا چاہتے تھے غالب اس جذبے کے ہاتھوں جس قدر مغلوب تھے اور کسی شے کے ہاتھوں نہ تھے۔ ان کی زندگی کی بیشتر تلخیاں اسی نمائشی بقا کی پیدا کردہ نہیں ہے مگر ذہن بڑا حقیقت پسند پایا تھا۔ یہ اور بھی تکلیف دہ بات تھی ورنہ وہ کشمکش سے محفوظ رہتے۔ ذہن عقل کے چراغ سے مستنیر تھا اور نئے زمانے کا ساتھ دینا چاہتا تھا۔ نہادو مزاج قدامت پسند مڑ مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھنے والا

کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

یہ تضاد نہیں کشمکش ہے اور تضاد وہاں ہوتا ہے جہاں کوئی آدمی مقصداً کہے کچھ اور کرے کچھ اور ان دونوں بظاہر ایک جیسی خاصیتوں میں فرق ہے مگر لطیف سا۔ غالب کہتے ہیں۔

ما لاغریم گر کمر یار نازک ہست
فرق است درمیانہ کہ بسیار نازک ہست

یہ کشمکش ہر فرد بشر کی ہستی میں موجود ہوتی ہے علم عقل، روح، ذہن دل، خمیر، قوت ارادی ہوس اور نہ جانے کیا کیا عوارض ہیں جو کبھی باہم متوافق ہوتے ہیں اور کبھی متصادم۔ نیت اور ارادہ نیک ہوتا ہے مگر مزاج بغاوت کرتا ہے دانش صحیح رہبری کرتی ہے مگر ہوس کا ریلا بہا لے جاتا ہے۔ ضمیر کی آواز صاف ہوتی ہے۔ مگر ضمیر اسے اپنے غل غپاڑے میں گوندھ لیتا ہے۔ گویا ہر فرد بشر ایک ایسا چلتا پھرتا قید خانہ ہے جو باہر سے پختہ و مضبوط دکھائی دے مگر اندر قیدیوں میں مسلسل جوتم پیزار ہو رہا ہو — آدمی بے خبری کی زندگی گزارے تو سب ٹھیک ہے۔ انگریزی مقولے کے مطابق بے خبری بڑی راحت ہے لیکن جس نے بھی ذرا سوچا وہ مارا گیا، اسے ہر سانس اعلان جنگ نظر آتا ہے۔

نہ دام دانم ونے دانہ ایں قدر دانم
ز فرق تا بقدم ہر چہ ہست در بند است

یہ اندرونی پیکار محض اندر کی پیداوار نہیں ہوتی۔ بیرونی مؤثرات باقاعدہ کار فرما ہوتے ہیں۔ وسائل رزق اور ان کی کشاکش، بندگی و خواجگی کی لذت و کلفت شرح و آئین کی پابندی و عدم پابندی، صنم اور خدا نہ جانے کیا کیا۔ کئی اندرونی محاذ، کئی بیرونی محاذ۔ پھر یہ کہ موثرات اور حسیات کا تناسب بھی ہر فرد میں

یکساں نہیں - چنانچہ تاب و تواں کے فرق نمودار ہوتے ہیں - کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شخصیت کے کئی عوارض و عوامل ہیں - اس لیے شخصیت کا تعین اور اس کی تجدید نا ممکن - اگر اس مجبوری کو سمجھ لیا جائے تو مزاجوں کا اتار چڑھاؤ ایک دلچسپ تماشا ہے اور جو آدمی اس اتار چڑھاؤ میں جس قدر مبتلا ہو اتنا ہی ہمدردی کے لائق ہے - ایسے پیغمبرانہ اوصاف کے مالک کتنے افراد ہوتے ہیں جن کی زندگیاں توازن و اعتدال کا صحیح نمونہ ہوں - اور پھر معاف کیجئیے اگر سارے آدمی متوازن ہوں تو زندگی حماقتوں سے محروم ہو جائے حالانکہ زندگی کی رنگا رنگی اور رونق فقط حماقتوں کی وجہ سے ہے - عقل تو بے رس اور خشک ہے جہاں سلامت روی ٹھوکر کھاتی ہے وہاں رونق پیدا ہو جاتی ہے -

مزی اندر جہانے کور ذوقے　　　که یزداں دارد شیطاں ندارد

آخر غالب بھی تو آدمی ہی تھے - وہ اس اتار چڑھاؤ کا شکار کیوں نہ ہوتے چنانچہ وہ خود کہتے ہیں -

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام　　　بے محابا دم ز عصیاں میزنم

غالب کو اس خوئے آدم نے مغلوب کر رکھا تھا وہ عمر بھر کش مکش کا شکار رہے - کبھی ایک جذبہ غالب آ گیا کبھی دوسرا جیسا ان کے شعر میں مزاجی اتار چڑھاؤ ہے - یوں بھی کہتے ہیں کہ

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

اور یوں بھی کہتے ہیں کہ -

دھوتا ہوں میں جو پینے کو اس سیم تن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

وہی غالب ہیں جن کا ارشاد ہے -

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

اور انہی کا قول ہے -

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

ایک جگہ فرماتے ہیں ۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

اور دوسری جگہ اس طرح کہ

واں وہ غرور عز و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

اور اس کے ساتھ ہی

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

غالب فرہاد پر اس کی سرگشتگیٔ رسوم و قیود کے باعث طعن توڑتے ہیں اور اپنے پندار کا صنم کدہ ویراں بھی دیکھنا چاہتے ہیں ۔ یہ وہ کش مکش ہے جس سے عمر بھر چھٹکارا نہ پا سکے ۔ آپ کو معلوم ہے کہ انہیں دہلی کالج میں پروفیسری قبول کرنے کے لیے بلایا گیا تھا ، وہ گئے ، مگر حکومت کے سیکرٹری جو ایک طرح سے انٹرویو لے رہے تھے ان کے استقبال کو نہ آئے ۔ جواب ملا کہ جب آپ رئیس کی حیثیت سے دربار میں آتے ہیں تو ہم آپ کا استقبال کرتے ہیں یہاں آپ ملازمت کے لیے ہیں ۔ قاعدہ اجازت نہیں دیتا کہ آپ کا استقبال کیا جائے ۔ یہ سن کر حضرت پھر پالکی میں بیٹھے اور گھر تشریف لے گئے ۔ خاندانی رئیسی کی توہین گوارا نہ تھی ۔ خمار رسوم و قیود کے سرگشتہ تھے ۔ دوسری طرف زندگی کے تقاضوں سے مغلوب ہو کر ہر انگریز حاکم با اختیار کا قصیدہ بھی کہا ۔ خواہ کوئی گورنر تھا ، سیکرٹری تھا ، کمشنر تھا یا ریزیڈنٹ ۔ اور جانتے بھی تھے کہ بھٹی کر رہے ہیں ۔ بارہا اپنے خطوط میں اپنی اس روش کے خلاف احتجاج کیا ہے ۔ یعنی اصول ایک طرف تھا اور مجبوری دوسری طرف ۔ ایک طرف حضرت غالب کھڑے تھے اور دوسری جانب میاں مغلوب — غالب کی اس مزاجی کیفیت کو ان کا یہ شعر بخوبی واضح کر دیتا ہے ۔

سنگ آمد و سخت آمد درد و سر خود داری
مجبور گراں جانی معذور سبک ساری

(پتھر آیا اور سخت آیا ۔ درد بھی ہو رہا ہے اور خود داری کا بھی پاس ہے ۔ اس لیے کہ ہم تحمل کے مدعی ہیں ۔ درد کا احساس ہے اس لیے کہ جان کمزور ہے ۔) ان کے یہاں گراں جانی اور سبکساری ساتھ ساتھ چل رہی تھی ۔

آپ کو معلوم ہے کہ غالب کے ایک دوست نے خط پر پتہ مفصل لکھ بھیجا تھا ، یعنی گلی ' کوچے ' محلے کا نام تحریر کر دیا تھا ۔ اس پر غالب بر افروختہ ہو گئے اور اپنے اس نیازمند کو ڈانٹ پلا دی کہ میں ایسا گرا پڑا اور گمنام نہیں کہ جب تک گلی کوچے محلے کا نام نہ ہو مجھ تک خط نہ پہنچے ۔ میرا نام اور شہر دہلی میں کافی ہے ۔ خط نہ ملے تو میرا ذمہ ۔ دوسری جانب اپنے مکتوب الیہ کو یوں بھی لکھ دیتے ہیں کہ گدائے بے سوال ہوں ۔ کچھ بھیج دو گے تو رد نہ کروں گا ۔

سوچا جا سکتا ہے کہ آیا غالب اس نمائشی بقا کے قفس کو توڑ نہ سکتے تھے ۔ تخت جاہ سے دستبردار نہ ہو سکتے تھے ۔ فیصلہ بظاہر کوئی مشکل نہیں مگر عملاً آسان بھی نہیں ۔ اس زمانے میں جب بارہ آنے میں مکان کرائے پر مل جاتا تھا اور چار روپے تنخواہ پانے والا شریفانہ وقت گذار سکتا تھا ۔ غالب کو ساڑھے باسٹھ روپے وظیفہ ملتا تھا ۔ خود اور بیگم ۔ بچے پیدا ہوئے اور کم سنی میں وفات پا جاتے رہے ۔ مگر رئیسوں کی رشتہ داری اور ان سے برابری کی ہوس نے مار ڈالا ۔ بیٹھی بھی کرتے تھے اور نوابی کی پاسبانی بھی فرماتے تھے ۔ گھر سے سوار ہوئے بغیر وضعداری کے خلاف تھا ۔ لہذا گھوڑے اور پالکی کا خرچہ لابد ۔ نہ ریاست نہ صندوق زر ، مگر داروغہ موجود ۔ جو آمد اور محلات کا حساب رکھنے کی جگہ دو چار شراب کی بوتلوں اور مقروضیت کے تمسکوں کی چوکیداری کرتا ۔ گھر میں ایک سے زیادہ خادمائیں باہر ڈیوڑھی پر ایک سے زیادہ خادم مگر خادم یا ملازم تو عام لوگوں کے ہوتے ہیں ۔ مرزا صاحب نواب تھے لہذا وہ نوابوں کی طرح ان ملازموں کو ڈیوڑھی کے سپاہی کہنے پر مجبور تھے ۔ آپ کو معلوم ہے کہ انگریزی دربار سے ان کا خلعت مقرر تھا مگر جب اردلی لوگ انعام پانے کے لیے آتے تو بقول حالی وہی خلعت پوشیدہ طور پر بازار میں بھیج دیا جاتا ۔ اور جو پیسے آتے ان میں سے اردلیوں کو انعام دے دیا جاتا ۔ یہ سارا ذہنی عذاب صنم کدہ پندار کو آباد رکھنے کی خاطر برداشت کیا جا رہا تھا ۔ مزاج رئیسانہ ، احوال واجبی ، وہ حساس تھے ، جھلاتے تھے مگر وضعداری کے قید خانے کی سلاخیں اور دیواریں جنہیں خود ہی استحکام بخشا تھا انہیں بے بس کیے ہوئے تھیں ۔

انہیں معلوم تھا کہ وہ غلط دور میں تشریف لائے تھے ۔ وہ خواہاں تھے کہ کسی ایسے شہنشاہ کے دور میں ہوتے جو ان کی طباعی کی داد میں اشرفیوں کے ڈھیر لگا دیتا ۔ وہ اشرفیوں ہاتھیوں پر لدواتے ۔ اشرفیاں گرتی جاتیں اور محتاج اٹھاتے جاتے ۔ وہ خطوط میں اس امر پر اظہار افسوس کرتے ہیں کہ اے کاش ان میں سکت ہوتی اور وہ شہر میں کسی کو بھی بھوکا نہ سونے دیتے کم از کم اپنے محلے میں تو ایسا

نہ ہونے دیتے ، مگر جہاں خود اپنا آزوقہ خطرے میں ہو وہاں کوئی دوسروں کی کیا مدد کرے ۔ لب لباب یہ کہ غالب خودی بیچ کر خودی کی نگہبانی پر مجبور تھے ۔ خودی کی تعمیر میں تخریب کا مسالہ لگاتے تھے

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

وہ اپنی اس صورت حال سے بخوبی آگاہ تھے مگر وضع و عادت کے ہاتھوں مغلوب تھے ، ہنستے چلے جا رہے تھے ۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

یہ تقابل و تصادم مضحکہ خیز تھا ۔ وہ خود بھی ہنستے تھے ۔ ایک دوست کو لکھتے ہیں کہ میں نے خود کو اپنا غیر جان لیا ہے ۔ کبھی آئینہ سامنے رکھ کر خود سے پوچھتا ہوں اے برقیارق اے سلجوق فلاں کا قرض کیسے اترے گا ۔ فلاں کی ڈگری کا کیا بنے گا ۔ بول ۔ مگر بولے کیا ، بے حیا بے شرم ،، اپنا اس طرح مذاق اڑا کر اپنی مغلوبیت پر پردہ ڈالتے تھے ۔

وہ لوگ جو سارے مرزا غالب کو ان کے کلام میں ڈھونڈتے ہیں خدا جانے سارے غالب کو وہاں پا سکتے ہیں یا نہیں ۔ اس لئے کہ شعر میں فقط آرزو اور جذبہ ہی نہیں ہوتا ۔ تخیل بھی کارفرما ہوتی ہے اور وہ بعض اوقات قافیے کی مجبوری کی پیداوار بھی ہوتی ہے ۔ شعرا حضرات جانتے ہیں کہ ان کے سینکڑوں مضمون ان کی طبیعت اور تمنا کے ترجمان نہیں ہوتے محض قافیوں نے سمجھائے اور عنائت فرمائے ہوتے ہیں ۔ اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ شاعر کی شخصیت کو بعض اوقات ان کی شاعری دھندلا دیتی ہے ۔ غالب کی شاعری پر فکر و تعقل کا غلبہ ہے ۔ تخیل کی ایجادپسندی جگہ جگہ بہار دکھا رہی ہے مگر عمومی زندگی میں غالب کی فکر و دانش کا حکم کہاں چلتا تھا ۔

آپ نے دیکھا ہے کہ غالب نے آزادہ روی کا بارہا دعوی کیا ہے ۔ رسوم و قیود کے خلاف ہیں ۔ ساتھ ہی وفاداری بشرط استواری کا بھی دم بھرتے ہیں ۔ سرسید نے آئین اکبری کی تصحیح کی اور غالب نے تنقیدی تبصرہ لکھوانا چاہا ۔ غالب نے اس ضمن میں ایک مثنوی لکھ دی اور انگریزی ایجادات کی بھرپور تعریف کی ۔ نئے آئین کا استقبال کرنے اور نئے زمانے کا ساتھ دینے کا زوردار مشورہ دیا ۔ یہاں تک کہہ دیا کہ

مردہ پروردن مناسب کار نیست

اس طرح سرسید کی ناخوشی مول لے لی مگر عملاً خود اپنا تورانی لباس بھی عمر بھر بدل نہ سکے پنج آہنگ میں خط و کتابت کے اسلوب پر اظہار رائے کیا اور کہا کہ عبارت آسان ہونی چاہئیے اور اسلوب ایسا کہ گویا کاتب اور مکتوب الیہ آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں مگر عمر بھر اپنے فارسی نثر کے مشکل اسلوب کو آسان نہ کر سکے ۔ روشن خیالی اور ترقی پسندی کے جملہ دعاوی کے باوصف اپنی فارسی کو قدیم لب و لہجہ عطا کرنے پر سارا زوردار صرف کرتے رہے اور ہاں مردہ پروردن مناسب کار نیست کا دعویٰ رکھنے کے با وصف اور اس دعوے کے باوجود کہ

بامن میاویز اے پسر فرزند ازر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

ایک مثنوی شروع کی جس میں مفصل تاریخ اسلام بیان کرنی چاہی ۔ اس کے آغاز میں فردوسی پر طعن توڑا ۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ مثنوی مکمل نہ ہو سکی ۔ اس لئے کہ ایک اور مجبوری کا سامنا تھا جس پر غالب غلبہ نہ پا سکتے تھے وہ یہ کہ ایسی مثنوی میں تخیل کی کارفرمائی اور صنعت کاری کی گنجائش نہ تھی ۔ چنانچہ مثنوی ایسی تیار ہوتی جو غالب کی شاعرانہ شان کے مطابق نہ ہوتی ۔ اس احتیال کے باعث خدمت اسلام کا سارا جذبہ سو گیا ۔ ان کے مذہب کے معاملے میں بھی ان کی مغلوبیت بارہا جلوہگر ہوئی ۔ سارے خاندان کا مذہب اہل سنت والا تھا مگر اپنے استاد ہرمزد یا دوست اور نسبتی بھائی مرزا علی بخش کی وجہ سے شیعیت کی طرف مائل ہو گئے ۔ ایک بار اپنے دوست میر سرفراز حسین کو تلقین کر بھیجی کہ قرآن ، فقہ حدیث پڑھ کر کیا مولوی بنا چاہیے ۔ علی علی کیا کر اور فارغ البال رہا کر ۔ میر سرفراز حسین شیعہ عالم تھے ، اس سے قطع نظر کہ وہ ایک مذہب کے قائل بھی تھے اور پھر اس کے مبادی و اصول کا مطالعہ بھی بے کار جانتے تھے ۔ مشورہ یہ دیا کہ فلسفہ پڑھ منطق پڑھ ۔ ہیئت و نجوم پڑھ جو انسان بنا چاہے ۔ وہی بات کہ

کعبہ مرے پیچھے ہے کلسیا مرے آگے

ہاں اور اس ضمن میں بھی مجبور حالات یعنی غالب مغلوب کو دنیاداری سے کام لینا پڑتا تھا ۔ آپ کو یاد ہے کہ ایک بار بہادر شاہ ظفر کو یہ اعلان کرنا پڑا تھا کہ وہ شیعہ نہیں ہیں اور اس موضوع پر غالب ہی سے مثنوی لکھوائی تھی ۔ اس طرح ایک بار غالب کو پتہ چلا کہ بہادر شاہ ظفر انہیں شیعہ جانتے ہیں تو غالب نے وہ قطعہ کہہ کر اس امر کی تردید کی جس کا آخری مصرع ہے

شیعہ کیسے ہو ماوراالنہری

یعنی کوئی دریائے جیحوں کے پرلی طرف کا رہنے والا یعنی ترک کیسے شیعہ ہو سکتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ خود بہادر شاہ بھی ماورالنہری تھے غالب نے جانا کہ یوں وہ خوش ہونگے ۔ ایک اور معاملہ جس کے ہاتھوں غالب بے بس تھے اور جو ان کے لئے خاندانی وجاہت کی پاسبانی ہی کی طرح نازک تھا وہ اپنی فارسی دانی کا یقین تھا ۔ وہ ہندوستانی نژاد فارسی دانوں میں سے خواجہ امیر خسرو کے قائل تھے ۔ تھوڑا بہت فیضی کو مانتے تھے ۔ کہتے تھے کبھی کبھی میاں فیضی کی بھی ٹیک نکل جاتی ہے ۔ باقی کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے ۔ ان کے نزدیک لائق سند فقط ایرانی نژاد سخندان تھے ۔ ہندی نژاد فارسی کو فرہنگ نگار اصحاب کا بری طرح ٹھٹھیا اڑاتے تھے ۔ مرزا قتیل کو جن کی بنگال و بہار میں بڑی مانتا تھی ، بہار کا کھتری بچہ کہہ کر رد کر دیتے تھے کوئی دوست یا عزیز اگر غالب کے موقف کے خلاف کسی قدیم استاد کا حوالہ دیتا تھا تو وہ کہہ دیتے تھے کیا اگلے وقتوں میں احمق نہ ہوتے تھے ۔ وہ اس معاملے میں ہرگز پروا نہ کرتے کہ کتنے دلوں کو دکھا رہے ہیں حالانکہ ان کا قول یہ ہے کہ ہر گناہ کر مردم آزاری نہ کر مگر یہاں پھر مغلوب تھے ۔ اسی زبان دانی کے زعم میں نواب کلب علی خاں کو بھی جو ان کے مربی تھے ، ناراض کر لیا بعد میں معافی مانگتے رہے ۔ غالب کا اپنی فارسی دانی کے ضمن میں موقف یہ تھا کہ انہوں نے ہر فرد جیسے ایرانی عالم سے فارسی سیکھی ہے جو دو سال ان کے یہاں مقیم رہا تھا ۔ وہ زرتشتی مذہب کو چھوڑ کر اسلام لایا تھا ۔ قدیم فارسی پر اسے کامل قدرت حاصل تھی ۔ نیز یہ کہ انہوں نے فارسی کا ذوق مبدأ فیض سے وافر پایا تھا ۔ لوگ ان کے دعوے کو تسلیم نہ کرتے تھے ۔ اس لئے کہ غالب خود ایرانی نہ تھے ترک تھے اور پھر ہرمزد کے وجود کو فرضی سمجھا جاتا تھا اور اگر فرضی نہ بھی تھا تو غالب کو گیارہ بارہ سال کی عمر میں فارسی قدیم و جدید کے جملہ رموز کسی طرح از بر ہو گئے ؟ مگر غالب اپنے دعوے سے دستبردار نہ ہوئے ۔ یہاں بھی وہ خود ستائی کے ہاتھوں مغلوب رہے ۔

اس ذیل میں ان کی ایک اور بے بسی کا ذکر ضروری ہے اور وہ یہ کہ اگر ان سے کوئی زبان کے موضوع پر بحث تمحیص کرتا تو وہ تلخ کلامی پر اتر آتے تھے اور جملہ وضعداری دھری رہ جاتی تھی ۔ بلکہ بعض اوقات معذرت کرتے کرتے الٹا اور چوٹ کر جاتے تھے ۔ مثلاً کلکتے میں جب وہ پنشن کے چکر میں مقیم تھے اور عمر تقریباً تیس برس تھی تو وہاں بھی فارسی دانی کا جھگڑا شروع ہو گیا اور مخالفوں نے غالب کو پریشان کر دیا ۔ غالب نے معذرت کے طور پر مثنوی لکھی جس میں رقم نہا کہ کسی کی دلشکنی مراد نہ تھی ۔ میں سب اہل علم کا قدردان ہوں اور یہ وہ ــــ

لیکن ساتھ ہی کہہ گئے کہ اس سب کچھ کے باوصف یہ کیوں ضروری ہو کہ میں ان کی تقلید بھی کروں

زلہ بردار کسی چرا باشم
من ہمایم مگس چرا باشم

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انہوں نے ایک نئی مصیبت اسی مغلوبیت کے باعث کھڑی کر لی تھی - جب دلی برباد ہو رہی تھی - عالی شان عمارات کا نشان مٹایا جا رہا تھا خود ان کے اپنے اعزاز اور دوست مفرور ہو رہے تھے یا پھانسی پا رہے تھے اس وقت بھی حضرت کے اعصاب اتنے مضبوط تھے کہ برہان قاطع کی غلطیاں نکالتے رہے اور بعد میں انہیں قاطع برہان کے نام سے چھاپ دیا - مصنف برہان کے خلاف بھی تند و تیز الفاظ استعمال کئے اور ہنگامہ کھڑا ہو گیا جو آخر مرزا کی طرف سے عدالت تک پہنچا - خود سخت سست کہتے مگر دوسروں کی تلخ کلامی پر بگڑتے اپنی طرف سے یہ عذر پیش کرتے کہ میں سپاہی زادہ ہوں - لہذا مجبور ہوں کہ درشت کلامی پر اتر آؤں - دوسروں کو کیا حق ہے کہ وہ درشت کلامی پر اتریں

من سپاہی زادہ ام گفتارمن باید درشت
وائے روئے گر تقلید من اینھا کردہ است

اہل نظر یہ کہتے ہیں کہ ذوق کے ساتھ بدمزگی ہو جانے اور بہادر شاہ ظفر کے برا ماننے پر انہوں نے جو معذرت نامہ تحریر کیا تھا اس میں بھی معذرت کرتے کرتے ذوق پر مزید چوٹ کر گئے تھے -

استاد شاہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
منظور اس سے قطع محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

"روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ" مگر کس روئے سیاہ غالب کا یا ذوق کا — اور پھر مصیبت یہ ہے کہ حضرت ذوق کا رنگ سیاہ تھا — تیر نشانے پر بیٹھا تھا -

اپنے بنائے ہوئے زنداں توڑ نہ سکنا اور خود ساختہ قید بے زنجیر میں مبتلا رہنا تقریباً ہر آدمی کا مقدر ہے جو زیادہ باشعور اور خود رائے ہے اسے زندگی کی

مجبوریوں کا نسبتاً زیادہ سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ چنانچہ ان میں سے بعض میں مغلوبیت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے ۔ عام آدمیوں کی یہ کشمکش یا اذیت سامنے نہیں آتی

داغ کا نام سن کے وہ بولے ایسے اسی ہزار پھرتے ہیں

مگر شاعر ، ادیب ، استاد ، خطیب ، حاکم اور لیڈر قسم کے افراد اسی ہزاروں میں سے نہیں ہوتے ، ان کا یہ تضاد مع ابتلا منظر عام پر آ جاتا ہے ۔ اس طرح یہ مخصوص طبقہ دوسروں کی نسبت زیادہ قیدی ہوتا ہے ۔ سارتر کی وجودیت میں پائے جانے والے غیر کی نظریں اس طبقے کو زیادہ چھیدتی ہیں ۔ باقیوں کے مقابلے میں اہل قلم اور بھی زیادہ ذمہ دار ہوتے ہیں ۔ اس لئے کہ ان میں سے بعض کو فقط اپنی ہمعصر نسل ہی سے نہیں ، بعد کی نسلوں کے روبرو بھی آنا پڑتا ہے ۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بعد میں آنے والی نسلوں کو ایک سہولت ضرور میسر ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ان کو شاعر و ادیب سے افکار سے نسبتاً واسطہ رہ جاتا ہے وہ انکی شخصیت کو پوری طرح سامنے نہیں رکھتے ۔ انہیں افکار و جذبات کی رعنائی لطف دے جاتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ ہم کلام غالب سے خوب لطف اندوز ہوتے ہیں ۔ پھر چونکہ ماضی خواہ مخواہ رومانی ہو جاتا ہے ۔ اس لئے آنجہانی اہل قلم حضرات بزرگ بن جاتے ہیں اور ان کی لغزش ، لغزش مستانہ نظر آتی ہے ۔ ہمعصر اہل قلم دشمن ہوتے ہیں ، بعد کی نسلیں ان سے پیار کرنے لگتی ہیں

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد

کا ایک معنیٰ ممکن ہے یہ بھی ہو ۔

"اگر شاعری کو ایک کہکشاں تسلیم کر لیا جائے تو اس کا سب سے زیادہ شوخ اور حسین ستارا غالب کو ماننا پڑے گا"۔ (کوثر چاند پوری)

سمیع اللہ قریشی
ایم - اے

فکر غالب کے رومانی عناصر

شخصیت در اصل ایک واضح وحدت ہوتی ہے اور صوری اعتبار سے ایک فن کار کی متحد شخصیت بالکل انہی جذبات پر مشتمل ہوتی ہے جو بنی نوع انسان کا عمومی اور فن کار کے ہم عصر انسانوں کا خصوصی لازمہ ہوتے ہیں ۔ تاہم فن کار کے موروثی روابط کے زیر اثر اس کے ماحول اور اس ماحول سے متعلق اس کے ذاتی رد عمل کے تحت اس کی ذات میں کچھ ایسے رجحانات ، میلانات اور جذبوں کی تخلیق بھی ہوتی رہتی ہے جو اس کی شخصیت کو ہر دوسرے انسان سے ممیز کر دیتے ہیں ۔ شخصیت کے ڈھلنے کا یہ وہ مرحلہ ہے جب مشترک اور عمومی جذبات بھی فن کار کے خالص ذاتی رنگ میں رنگین ہو جاتے ہیں ۔ مشترک جذبات اور شخصی جذبات کی آمیزش اور رچاؤ سے فن کار کا معنوی وجود تشکیل پاتا ہے ۔ صوری اور معنوی پہلو مل کر شخصیت کو وحدت بخشتے ہیں ۔ تشکیل وحدت کے اسی عمل میں اگر صوری پہلو غالب ہو تو فن کلاسیکی شمار ہوتا ہے اور اگر معنوی اثرات حاوی ہوں تو رومانیت کی ذیل میں آتا ہے ۔

ذہنی اخلاق اور عمرانی اعتبار سے مطمئن معاشرے کا فن کار عموماً اپنی شخصیت کے صوری پہلو کے اظہار کو ترجیح دیتا ہے ۔ نتیجۃً اس کے فن میں کلاسیکیت کی روح سمٹ آتی ہے ۔ لیکن تاریخ نے معاشرے کے ذہنی ، اخلاق اور عمرانی اطمینان کے استحکام کی ضمانت کبھی نہیں دی ۔ معاشرہ جامد ہو جاتا ہے تو رسمیات کی زنجیریں آپ سے آپ ٹوٹنے لگتی ہیں اور روایات کی دیواریں خود بخود چٹخنے لگتی ہیں ۔ اس وقت بالکل نئے اور تازہ تصورات اور فکری ڈھانچے نمو پانے لگتے ہیں گویا معاشرہ وقتاً فوقتاً اپنا قالب بدلنے پر مجبور ہوتا ہے اور اس میں ایک تازہ روح کے بیدار ہونے کے امکانات ہمیشہ باقی رہتے ہیں ۔ قدیم اصول ہوں یا اسالیب ہر چیز آزادی کے نئے احساس کے

ساتھ سانس لینے لگتی ہے ۔ چنانچہ فن کار کے وجود کا معنوی پہلو روایت سے بغاوت جذبے کی شدت ، احساس کی گرمی ، روحانی تاثر ، نازک پیرایۂ اظہار اور ابہام کے ساتھ آگے آتا ہے ۔ اس عہد اضطراب کی ہر تخلیق پر رومانیت کی چھاپ ہوتی ہے ۔ اگرچہ یہ صورت حال بھی مستقل نہیں ہوتی بلکہ تاریخ کے جدلیاتی عمل کی طرح ہر عہد اپنے متضاد عہد پر ختم ہو جاتا ہے ۔

رومانی تخلیق کی معنوی اہمیت کے باوجود اس کے صوری پہلو کو ترک نہیں کیا جا سکتا ۔ البتہ رومانی تخلیق کا معنوی پہلو اپنے تنوع اور جدت کی وجہ سے ہمیشہ صوری پہلو پر حاوی ہوتا ہے ۔ اس طرح اس میں وہ ساری چیزیں سمٹ آتی ہیں جو زمان و مکان کی قید سے ماوراء ہو کر ساری انسانیت کا مشترکہ سرمایہ ہوتی ہیں ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ رومانی تخلیق میں نسبتاً کلاسیکی تخلیق سے زیادہ قبولیت عامہ حاصل کرنے کی اہلیت پائی جاتی ہے ۔ ویسے بھی فن کار کے خالص ذاتی اور شخصی تجربے اور واردات کے اظہار سے صورت اور ہیئت کو نئے مفاہیم عطا ہوتے ہیں اور لفظ کو نئے معانی ملتے ہیں ۔ گویا صورت میں کچھ مزید ایسے اجزاء شامل ہو جاتے ہیں جن سے لفظ کی شکل اور واضح ہو جاتی ہے ۔ یہ ذاتی عنصر ہے جو لفظ کے عمومی تصور کو تنوع اور جدت بخشتا ہے ۔ یہی صورت اور معنی کا اتحاد ہے ، یہی فن کار کی شخصیت کی صوری اور معنوی وحدت بھی ہے اور یہی دونوں عناصر رومانی تخلیق کے لازمے بھی ہیں ۔

غالب کے عہد کا مزاج عمومی طور پر بے شک کلاسیکی تھا اور اس پر بحیثیت مجموعی معاشرتی ہیئت کا صوری پہلو غالب تھا لیکن کلاسیکی عہد میں کسی رومانی فن کار کی پیدائش یا دریافت کوئی حادثہ بھی نہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلاسیکیت اور رومانیت کی اصطلاحوں سے صرف معاشرتی یا فنی ادوار کی تخصیص نہیں ہوتی بلکہ ہر نئی تخلیق کی نوعیت بھی مشخص ہوتی ہے ۔ اور یہ رائے Abercrombie کی ہے ۔ چنانچہ وہ انسانی فطرت جس کا اظہار فرد اور معاشرہ دونوں کے ذریعہ ہوتا ہے در حقیت وہی انسانی فطرت ، رومانی اور کلاسیکی رویے کی تعین بھی کرتی ہے ۔ غالب کی متحد شخصیت پر معنوی اظہار کا غلبہ ان کے طبعاً رومانی ہونے کی دلیل ہے ۔ اور اس بات میں تو کوئی کلام نہیں کہ ان کی شاعری کا عمومی رجحان رومانیت کی طرف ہے اور ان کی نفسیات ایک رومانی جینیئس کی نفسیات ہے ۔ ویسے بھی عظیم شاعری اور رومانی اثرات کبھی دو متضاد چیزیں شمار نہیں کیے گئے ۔ تاریخ ادبیات عالیہ کے ہر دور اور ہر زبان میں رومانیت کی روح جاری و ساری تسلیم کی گئی ہے کیونکہ رومانیت ادب میں اس خاص طرز فکر کا نام ہے جو عقلیت کے فلسفے کے خلاف ایک

رد عمل ہے ۔ وہ طرز فکر جو روسو ، ورڈزورتھ ، کولرج ، شیلے ، بائرن ، کیٹس ، آرنلڈ اور براؤننگ کے ساتھ منسوب ہے غالب کی شاعری میں بھی موجود ہے ۔ غالب کی فکر کا رومانی پہلو ان کے ہاں کسی باقاعدہ تحریک سے متاثر ہونے کا نتیجہ نہیں ، نہ ہی غالب نے جان بوجھ کر رومانیت کو اپنے اوپر طاری کیا ہے بلکہ اس کا اظہار ان کے ہاں بالکل فطری اور بے ساختہ ہے اسی لیے انہیں طبعاً رومانی قرار دینا زیادہ درست ہے ۔ان کے ہاں رومانی بے ساختگی ان کے مخصوص انداز فکر کی دیگر علامتوں کی طرح نہ صرف یہ کہ اپنے عہد میں بلکہ آج تک اردو شاعری میں بہت زیادہ نمایاں ہے ۔

غالب کے شعری شعور میں دو چیزیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں اول یہ کہ شاعری محض چند مسلمہ حقیقتوں اور مروج عقیدوں کے اظہار کا نام نہیں بلکہ فطرت کی انفرادی صورت کی تخلیق بھی ہے اور دوم یہ کہ اظہار فطرت کا وجدانی ادراک بھی شاعری کا ، وضوع بن سکتا ہے ۔ اتفاق سے یہی دونوں باتیں رومانیت یا اظہار کی امتیازی صفات بھی ہیں ۔ رومانیت جس طبع زادگی ، انفرادیت ، جذباتیت ، لاشعوریت ، برجستگی ، بے ساختگی اور انسان کی بے زنجیر فطرت کی نمائندگی کرتی ہے غالب کی شاعری کے تفصیلی مطالعہ سے بھی وہی نتائج اخذ ہوتے ہیں ۔

فرد ذات یا انفرادیت کا تصور غالب کے ہاں اس قدر گہرا اور شدید ہے کہ وہ کل کائنات کو صرف اپنے معیار پر جانچنے اور پرکھنے کے لیے تیار ہوتے ہیں ۔ فرد سے بڑھ کر کوئی چیز ان کے لیے قابل ترجیح نہیں ۔ یہاں تک کہ ان کے نزدیک اگر کائنات کا خارجی پہلو بھی کوئی وزن رکھتا ہے تو یہ بھی فرد ہی کے دم قدم سے ہے ورنہ محض 'تماشا' اور 'بازیچۂ اطفال' ہے ۔ انہیں اپنی ذات اور اپنی صلاحیتوں پر حد درجہ اعتماد ہے ۔ یہ کہنا درست ہے کہ رومانوی فرد پرستی کا آغاز ہی اردو شاعری میں غالب کے ذریعہ ہوتا ہے جو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ 'مجھے تو وبائے عام میں مرنا بھی پسند نہیں' ان کے بعض اشعار اردو شاعری میں رومانوی فرد پرستی کی پہلی اور باقاعدہ مثال ہیں اور رہیں گے :

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجیے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

در اصل یہیں سے یعنی انفرادیت پرستی ہی سے اپنے ہاں کی مخصوص اور مسلمہ شعری روایت سے انحراف کا آغاز ہوتا ہے اور روایت کے معاملے میں غالب کا رد عمل اپنے ہر ہم عصر فن کار سے یکسر مختلف تھا کیوں کہ وہ روایت کی اندھی تقلید کی بجائے نجی تجربے کے زیادہ قائل تھے۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا

کوہکن نقاش یک تمثال شیریں تھا اسد
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

عشق مزدوریٔ عشرت گہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں

روایت سے انحراف رومانیت کی ایک نمایاں اور امتیازی خصوصیت ہے۔ غالب کا کمال اس سلسلے میں یہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی تجربات میں عموماً جاعتی احساس عمداً شامل نہیں ہونے دیتے تاکہ ان کی انفرادیت مجروح نہ ہو جائے۔ فرد کو جاعت سے بے نیاز کر دینے والی کیفیت رومانیت کی انتہا کہلاتی ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر جزو کی قدر و قیمت کل سے بڑھ جاتی ہے اور جذبے کو حقیقت پر ترجیح حاصل ہو جاتی ہے لیکن غالب کے ہاں جذبے کی شدت عقل کی گرفت سے باہر نہیں ہونے پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فلسفی تو نہیں مگر ان کے انداز اور اسالیب فلسفیانہ ہیں :

شاید کہ مر گیا ترے رخسار دیکھ کر پیمانہ رات ماہ کا لبریز نور تھا

ہوں گرمیٔ نشاط تصور سے نغمہ سنج میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

ہجوم فکر سے دل مثل موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

ساغر دیدۂ سرشار ہے ہر ذرہ خاک
شوق دیدار بلا آئینہ سامان نکلا

فریب صنعت ایجاد کا تماشا دیکھ
نگاہ عکس فروش و خیال آئینہ ساز

غالب نے تخلیق کے عمل میں ہمیشہ لامحدودیت کے تصور سے کام لیا ۔ انہوں نے ہمیشہ زندگی کو بیکراں اور ممکنات سے پر جانا اور حقیقت کے موجود دائرے کو ہمیشہ سمٹا ہوا پایا ۔ اسی لیے انہوں نے اپنے لیے ایک عینی دنیا تلاش کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کے نا آسودہ جذبوں کی تسکین کے سامان ہو سکیں ۔ غالب نے ہمیشہ انسان ہی کو مرکز کائنات تصور کیا اور جذبے اور تخیل کی کار فرمائی کو اس قدر اہمیت دی کہ ہمیشہ حقائق کی داخلی توجیہہ کو ترجیح دینا پسند کیا ۔ یہاں تک کہ ایک فرد میں بے انتہا خفتہ امکانات کی موجودگی کو بطور اصول حیات تسلم کر لیا ۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

یہ درست ہے کہ غالب طبعاً رومانی تھے لیکن یہ درست نہیں کہ ان کے ذہنی رویے میں کوئی لچک نہ تھی ۔ واقعہ یہ ہے کہ آن میں دو متضاد چیزوں سے لذت اٹھانے کا حوصلہ بھی پایا جاتا تھا :

وداع و وصل جداگانہ لذت دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

اسی لیے ان کے ہاں نشاط غم بھی ہے اور غم نشاط بھی ۔ عظیم اور آفاق شعراء کے ہاں داخلیت ، خارجیت ، مصروفیت ، رومانیت ، کلاسیکیت ، شخصیت اور کردار میں امتیاز پیدا کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے ۔ اس پر مستزاد یہ کہ غزل کی صنف ایسی صنف ہے جس پر داخلی ، معروضی ، کلاسیکی یا رومانی کوئی نام نہیں چپکایا جا سکتا یہ تو ایک عمومی چیز ہے جس میں زیادہ سے زیادہ انفرادیت کا رنگ ابھر سکتا ہے اور یہی انفرادیت غالب کے ہاں خوب خوب موجود ہے ۔ تسلیم و رضا ، تہذیب و تکسیر نفس یا پابندئ رسوم و قیود کی صفات جو رومانی رویے کا عکس ہیں اور کسی

حد تک کلاسیکیت کا خاصہ ہیں غالب کے ہاں ان سے یکسر دامن بچا کر چلنے کا رجحان نہیں پایا جاتا۔ ان کے ہاں بے شک ایک طرح کا تضاد پایا جاتا ہے لیکن اس کی وجہ ان کی شخصیت کا بھرپور اور پہلو دار ہونا ہے۔ کولرج نے رومانیت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے یہ ''آہنگ تضاد ہے'' گویا شخصیت کی جانچ اور پرکھ کے لیے تضاد میں آہنگ کی تلاش از بس لازمی اور ضروری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غالب کی شخصیت اور اس کے فکر میں متضاد پہلو بے شک موجود ہیں مگر اس تضاد میں ایک آہنگ بھی موجود ہے۔ کچھ ایسے ہے جیسے رومانی اور کلاسیکی رویے ان کے ہاں ایک دوسرے کی قیمت پر متشدد صورت اختیار نہیں کرتے اور نہ ہی ایک دوسرے کی ضد بن کر سامنے آتے ہیں۔ غالباً غالب کے فکر کا حسن ہی اس بات میں ہے کہ ان کے ہاں زندگی کے بارے میں ان دونوں اہم رویوں کا ایک انجذاب پایا جاتا ہے۔ لیکن شاعری کا چونکہ بالطبع میلان رومانیت کی جانب زیادہ ہوتا ہے اس لیے غالب کے فکر کا رومانی رویہ اس کے کلاسیکی رویے پر عموماً چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ البتہ ان کی فکر سے متأثر لوگوں کو ان کے رومانی لب و لہجہ کا احساس پہلی دفعہ اس عہد میں ہوا جب نئی نسل نصاب تعلیم کے واسطے سے انگریزی زبان٭ کے رومانی شاعروں کی تخلیقات سے آشنا ہوئی اور عوام آزادی کے مفہوم سے آگاہ ہوئے۔ غالب ہی کے بارے میں سوچنے کا انداز اس لیے بھی عام ہوا کہ ان کے اکثر اشعار محض اشعار نہیں بلکہ ایک مکمل رویہ ہیں۔ اس لحاظ سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی جو عالی شان تہذیب مغلوں کے زوال کے ساتھ زوال آمادہ اور رو بہ انحطاط ہوئی تھی اس کو فکری سنبھالا دینے والوں میں جہاں شاہ ولی اللہ کا نام لیا جائے گا وہاں غالب کا ذکر بھی ہوگا کیونکہ شاہ ولی اللہ کی طرح غالب بھی ایک ایسی وجدانی حس کے مالک تھے جو آنے والے عالمی انقلابات کا پتہ پہلے سے پا لیتی ہے۔ مغربی علوم سے ناواقف ہونے کے باوجود غالب کے ہاں رجعت پسندی کی بجائے مستقبل پسندی کا رجحان غالب تھا۔ آئین اکبری پر لکھی ہوئی ان کی تقریظ ان کے پیغمبرانہ شعور کی گواہ ہے۔

اگر رومانیت انفرادیت پسندی ہے تو ایک قسم کی دروں بینی بھی ہے جس کے زیر اثر رومانی افتاد خارجیت سے بڑھ کر داخلیت پسند ہوتی ہے اور خلوت کو بجائے خود اک محشر خیال سمجھنے یا خود مرکزیت کا رجحان عام ہوتا ہے۔ یہی غالب کا مسلک بھی ہے۔ ان کے ہاں اپنی داخلی شخصیت کو بے نقاب کرنے کی ایک ایسی صحت مند امنگ پائی جاتی ہے جس کا محرک محض انسان دوستی ہے۔ غالب نے ابلاغ کی خاطر ذریعۂ ہائے اظہار آپ ایجاد کر کے دوسروں تک اپنے جذبوں اور

اپنی سوچ اور فکر کی آنچ پہنچائی - انہیں حقیقت کا ادراک تعقل سے زیادہ جذب اور وجدان کے ذریعے ہوتا ہے اور یہی رومانیت ہے -

تفکر کے آزادانہ اظہار کے لیے خارجی سے زیادہ داخلی توازن کی ضرورت ہوتی ہے جو رومان پسندوں کا خاصہ ہے اسی لیے وہ آس پاس کے نظریات اور معتقدات کو درخور اعتناء نہیں سمجھتے نہ ان سے مطمئن ہوتے ہیں - اس معاملے میں ان میں روایت پرستوں والی کوئی بات نہیں پائی جاتی - یہ اور بات ہے کہ اس رویے کی پابندی میں ایک لذت آزار والا مرحلہ بھی آتا ہے جہاں سے وہ بخیر و خوبی گزر جاتے ہیں اور ہر رومان پسند کی طرح اس لذت آزار کو سرمایۂ حیات سمجھتے ہیں کیونکہ دیدہ دانستہ اور جان بوجھ کر غم سے لذت کوشی کرنا ایک رومانی شخصیت کا میلان ہے -

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

سختی کشان عشق کی پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے
کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی ہے

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

ایک چیز جو غالب کے ہاں سب سے زیادہ رومانی عناصر کا پتہ دیتی ہے وہ ان کے ہاں جذبات کی فراوانی ہے اور یہ وہ خاصہ ہے جو تمام رومانیوں کے ہاں طرۂ امتیاز ہے ۔ غالب اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ اظہار کا حسن جذبے کی حرارت کا محتاج ہوا کرتا ہے اور فن کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو پاتی جب فکر کے موثر اظہار کے لیے جذبات کی آنچ کا سہارا نہ لیا جائے یہی غالب کا وہ رومانی انداز ہے جو ان کی فکر کو کبھی بے رونق نہیں ہونے دیتا ۔

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی
نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ تیرے رخ پر بکھر گئی
فردا و دے کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنان خطۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر
روکش سطح چرخ مینائی
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کے دیکھنے کے لیے
چشم نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی

پوچھ مت وجہ سیہ مستیٔ ارباب چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موج شراب

غالب کے ہاں اس واقعیت کا پتہ بھی ملتا ہے جو ادب میں رومانی طبائع کا خاصہ ہوا کرتی ہے لیکن غالب کے فکر میں واقعیت سے مراد سستی قسم کا واقعہ نگاری

ہرگز نہیں جس کی بنیاد زندگی کے خارجی مظاہر پر ہوتی ہے بلکہ ان کی واقعیت گرمئی نفس سے ابھرنے والی حقیقتوں کی واقعیت ہے جو تخیل کی مرہون ہوا کرتی ہے ۔ وہ جن باطنی عوامل کی تصویر کشی کرتے ہیں قوت بیان ان کو اپنی گرفت میں لانے سے عاجز ہے ۔ ان کا اظہار علامتی اور رمزی ہو سکتا ہے ۔ چنانچہ ایمائیت جو رومانیت ہی کا ایک پہلو ہے غالب کے ہاں اسے بہت زیادہ دخل حاصل ہے ۔ موج نگاہ ، محشر خیال ، جنت نگاہ ، قلزم صرصر ، نبض خس ، خار رسوم ، قلزم خون ، جزنبار نغمہ ، فردوس گوش ، رخش عمر ، شیرازۂ مژگان ، برگ ادراک ، گزرگاہ خیال ، شہر آرزو ، دام تمنا ، وادیٔ خیال ، دامان خیال ، چشم صحرا ، دشت وفا اور موج سراب جیسی خوبصورت ترکیبیں عمر بھر کے جالیاتی تجربوں کا علامتی یا ایمائی اظہار ہیں ۔ فطرت اور اس کے مظاہر سے غالب نے رومانیوں کی طرح بے شمار خوبصورت اور مرصع تشبیہات اور استعارے اخذ کیے ہیں ۔ ان کی تمام تشبیہات حسی ہیں اور ان تمام تشبیہات میں بے شمار رنگوں کی آمیزش کا احساس ہوتا ہے اسی لیے ان کے اکثر اشعار الفاظ کے چوکھٹوں میں لگی ہوئی تصویر دکھائی پڑتے ہیں ۔ ان تصویروں میں یوں تو قطرت کے تمام رنگ جلوہ گر ہیں لیکن آتشیں رنگ سب پر حاوی نظر آتا ہے ۔ چہرے کی سرخی ، شراب کی سرخی ، گلاب کی سرخی ، خون کی سرخی ، آگ کی سرخی ، رومانی انقلاب پسندوں کی طرح انہیں سرخ چیزوں سے بطور خاص لگاؤ ہے ۔ ان کے ہاں صرف خیالات کا حسن ہی نہیں الفاظ کا حسن بھی پایا جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار نغمگی سے بھی بھرپور ہیں ۔

غالب اس مغل قبیلے کے ایک فرد تھے جس نے ایشیا میں تعمیرات ، مصوری اور ادبیات میں لازوال ورثہ چھوڑا ۔ حسن پرستی ان کی نسلی خصوصیت تھی ۔ یہ احساس نسلی طور پر غالب کے ہاں شدید تھا وہ طبعاً اور روائتاً حسن پرست تھے ۔ محبت کرنے کا جذبہ انہیں بے شک اسی احساس حسن نے بخشا تھا لیکن خاص طور پر عورت سے محبت کے جذبات کا اظہار کر کے انہوں نے عشق کے جنسی اہمیت کو ترجیح دی تھی ۔ اس لحاظ سے انہوں نے مشرق کی شعری روایت سے ایک طرح کا انحراف بھی کیا تھا ۔ ان کے ہاں رومانی انقاد کا اظہار یوں بھی ملتا ہے کہ وہ پرستش پر خواہش کو فوقیت دے کر جذبۂ عشق کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں جو نہ صرف ان کی اپنی افتاد سے پوری طرح ہم آہنگ ہے بلکہ انسانی نفسیات سے بھی مناسبت رکھتی ہے ۔ انہوں نے عشق کو ہمیشہ رونق ہستی قرار دیا ۔

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

انسانی زندگی کا کوئی خوبصورت لمحہ ، خوشگوار حادثہ ، فطرت کے مناظر ، شہروں اور عمارتوں کا حسن ساری ہی چیزیں انہیں بے طرح بھاتی ہیں مگر عورت کے حسن دل افروز سے اکتساب لذت کا جذبہ ان میں زندگی کی ہر خوبصورت شے سے بڑھ کر سرشاری پیدا کر دیتا ہے ۔ ان کی خواہش بے شک جنسی اور مادی ہے مگر ان کا عشق ایک باشعور ہستی کا عشق ہے ۔ اپنے عہد تک کے تمام دوسرے شاعروں میں غالب ہی ایک ایسے ہیں جن کے ہاں جسم اور روح میں علیحدگی اور گریز کی بجائے رچاؤ اور جذب کا رجحان غالب ہے ۔ غالب جسمانی حسن سے ذہنی حسن کی طرف آتے ہیں ۔ اس تہذیبی عمل کو شائستگیٔ نفس بھی کہا جا سکتا ہے وہ حسین سے حسین تر چیزوں کے متلاشی ہیں اور کسی مرحلے پر بھی حسن کی تلاش اور اس کا پیچھا کرنے سے باز نہیں رہ سکتے لیکن کسی ایک حسین چیز سے وابستگی بھی اُن کے بس کی بات نہیں ۔ وہ چاہتے ہیں علی العموم حسن کی پرستش کی جائے ۔ ایک شاگرد کو مشورہ بھی دیتے ہیں کہ ''دعویٔ حسن پرستی علی العموم رہے تو اچھا ہے'' گویا وہ حسن کی بجائے کلیۂ حسن کے قائل ہیں اور یہ خالص رومانی افتاد ہے ۔ خوبصورت چیزوں کو دیکھ کر ان کا ایمان ہمیشہ متزلزل ہو جایا کرتا تھا ۔ بنارس پہنچے تو یہاں تک کہہ گئے کہ دلی مٹ جائے تو بے شک مٹ جائے اگر بنارس موجود ہے تو کوئی غم نہیں ۔ کلکتہ آئے تو پکار اٹھے کہ دلی کے بغیر بہت زیادہ دن نہیں رہا جا سکتا ۔ کلکتے سے لوٹے تو اس نیم مشرق نیم مغربی شہر کے ذکر پر سینے میں ایک چبھن کا احساس ہونے لگتا ہے ۔ دلی لٹ گئی تو ''ہائے دلی وائے دلی'' کرنے لگے اور خوب خوب اس کی یاد میں آنسو بہائے ۔ وہ کہیں اور کبھی مطمئن نہ ہوئے ۔ دلی ، بنارس اور کلکتے کی خوبصورت اور شگفتہ یادیں ہمیشہ ان کا ذہنی سرمایہ رہیں ، بنارس کی صبحوں کا حسن ، چراغ دیر اور بتان بت پرست و برہمن سوز کا نظارہ ، دلی کے مہ رخوں سے تقریب ملاقات کی خاطر مصوری سیکھنے کے شوق کا اظہار اور کلکتے کے نازنین بتان خود آراء یا خوبان کشور لندن کی یادوں کو دل کے نگار خانے میں سجائے پھرنا غالب کی رومانی طبیعت کا خاصہ تھا ۔ اپنی متلون مزاجی پر آپ ہی جنجھلا اٹھتے ہیں ۔

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکن زلف عنبریں کیوں ہے
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے

وہ عمر بھر حسن کے متلاشی تھے ، رہے مگر اپنی کم مائیگی سے بھی

واقف تھے -

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے
چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

غالب نے تمام رومانیوں کی طرح گمشدہ حسن کے نوحے لکھے :

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ان کی وہ تمام نمائندہ غزلیں جن میں حد درجہ داخلی ربط کا احساس ہے دراصل بے نام مرثیے ہیں - گلستان حیات کو "وصال لالہ عذاران سرو قامت" سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی بھرپور خواہش نے غالب کو رومانی حقیقت نگار اور واقعیت پسند بنا دیا تھا - انھوں نے بے شک عشق اپنا "سر و ساماں" سمجھا - مگر یہ وہ روایتی عشق نہ تھا جس میں پاک دامنی شرط ہوا کرتی ہے لیکن ان کا عشق جسمانی اتصال چاہتا ہے - ان کی رومانیت کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے ہمیشہ عشق کے نتیجے میں پیدا ہونے والی لذت کو محسوس کیا اور عشق میں آزار یا اندوہ کا لطف اٹھانے کے ہمیشہ رسیا رہے -

تیرے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے
جلوہ ریزئ بادۂ پر فشانئ شمع

ہم نے وحشت کدۂ بزم جہاں میں جوں شمع
شعلۂ عشق کو اپنا سر و ساماں سمجھا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہوگئیں

گل کھلے غنچے چٹخنے لگے اور صبح ہوئی
سرخوش خواب ہے وہ نرگس مخمور ابھی

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال
ہوگیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

اک نگار آتشیں رخ سر کھلا

غالب کی فکر کا ایک رومانی پہلو یہ بھی ہے کہ ان کی طرح ان کی محبوبہ بھی انسان ہے:

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

دیکھیے غیر سے کیا خوب نبھائی اس نے
نہ سہی ہم سے پر اس بت میں وفا ہے تو سہی

جان کر کیجیے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہ غلط انداز توسم ہے ہم کو

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستم گر
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

غالب کے مختلف اشعار میں ان کی شوخ و شنگ اور متحرک محبوبہ کی رنگین تصویریں موجود ہیں جو جمال دلفروز اور صورت مہر نیم روز کی حامل ہے:

پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن
دست مرہون حنا رخسار رہن غازہ تھا

لرزے ہے موج سے تری رفتار دیکھ کر
لطف خرام ساقی و ذوقِ صدائے چنگ

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسب رنگ فروغ
خط پیالہ سراسر نگاہ گلچیں ہے

آ اے بہار ناز کہ تیرے خرام سے
دستار گر و شاخ گل نقش پا کرھا

گریہ از بس ناز کی رخ باندہ برخاکش نگر

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتقد فتنہ محشر نہ ہوا تھا

دیکھو تو دلفریبی انداز نقش پا
موج خرام ناز بھی کیا گل کتر گئی

سطوت سے ترے جلوہ حسن غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگ ادائے گل

غالب انانیت اور خود پرستی کے شکار بھی ہیں ان کی وہ غزل انانیت کی بھرپور مثال ہے جس کا مطلع ہے :

ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے
بازیچہ اطفال ہے دنیا میرے آگے

احساس محرومی و نارسائی اور عینیت پرستی ان کی شخصیت کے لازمے ہیں اور ان کی فکر کے مطالعہ سے یہ احساس بھی پختہ تر ہو جاتا ہے کہ رومان پرستوں کی طرح غالب بھی زندگی کی پیاس کبھی نہ بجھا سکے ۔ اگر یہ بات درست ہے کہ رومانیت کی سب سے بڑی خصوصیت تخیل اور تخیلات کی پرستش ہے تو غالب واقعی بہت اونچے رومان پرست تھے ان کی شاعری ان کی عمر بھر کی محرومیوں کی ذہنی تلافی کا ایک انداز ہے ۔ اپنی غزلوں میں وہ زندگی سے لپٹ کر پیار کرنے والے رومانی نظر آتے ہیں ۔ ان کے رویے میں لذت کوشی کے لیے ایک اثباتی اضطراب پایا جاتا ہے اور ان کی غزلوں میں جس محبوب کا عکس کھنچتا ہے وہ خود ایسی رومانیت کا حامل ہے جو دلوں کی آگ بجھنے نہیں دیتا ، بلکہ جس قربت کے احساس سے آنچ آتی ہے ۔

ہوں گرمئی نشاط تصور سے نغمہ سنج

اس لافانی غزل میں جو رومانی اظہار کی بھرپور مثال ہے اور جس کا مطلع ہے :

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے

غالب نے اپنی محبوبہ کا ایک دلآویز اور رنگین مرقع پیش کر دیا ہے ۔

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے
اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل پہ آرزو
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

غالب قلب انسانی کی لطیف کیفیتوں اور آرزوؤں کو ایسے خوبصورت اور مرقع انداز اور پرجوش لب و لہجے میں پیش کرتے ہیں کہ ہر شخص ان کیفیتوں اور آرزوؤں میں شریک ہو جاتا ہے وہی آرزو مندی جو رومانیت کا بنیادی عنصر ہے اور شوق کے مرحلے جس کے لازمے ہیں غالب کے ہاں بھی موجود ہے داخلی تحسسات کو خارجی مظاہر کے ساتھ ہم آہنگ کرکے دکھانے کا جو کمال غالب کو حاصل تھا وہی اعلیٰ فکر کا کمال ہوا کرتا ہے ۔ ورنہ اپنے آپ ان کے سامنے کبھی راستے روشن نہ ہوتے یہ راہیں اور منزلیں انہوں نے خیال کے واسطے ہی سے طے کیں :

مستانہ طے کروں ہوں رہ وادیٔ خیال

زبان خیال اور آہنگ کی گنجائش غزل کے روایتی پیکر میں پیدا کر دینے کا

معجزہ غالب کی رومان پرست فطرت کے ہاتھوں عمل میں آیا ۔ رومانیت روایت سے بغاوت کا نام بھی ہے غالب نے یہ کام غزل کے شعری پیکر میں تبدیلی کر کے پایہٴ تکمیل کو پہنچایا ۔ غزل میں جذباتی اور فکری اعلان اور حسیہ اظہار خیال کی ابتدا انہی سے ہوتی ہے ۔ ان کے ہاں خالص حسی تجربے پر مشتمل بہت سے اشعار موجود ہیں پیکر غزل میں پہلی دفعہ معنویت ، گہرائی اور تنقید کی لافانی خوبیاں سمو دینے والے غالب ہی تھے ۔ اپنی شاعری میں جس سماجی خود آگاہی کا ثبوت انہوں نے دیا وہ بذات خود ایک رومانی انداز فکر ہے ۔ ان کے اشعار سے ایک مبہم بے اطمینانی اور موہوم آرزو مندی کا پتہ ملتا ہے ۔ زندگی کو انہوں نے ہمیشہ ذاتی تجربے اور داخلی تاثرات کا رنگین مجموعہ سمجھا ہے ۔ ابہام اور ژولیدگی خالص رومانی ذہنوں کی افتاد سمجھی گئی ہے ۔ رومانی ادب میں جمالیاتی خود فراموشی کی کیفیات عام ہوتی ہیں ۔ غالب کے فکر میں بھی زندگی وفور حسن اور صداقت حسن سے عبارت ہے اور جمالیاتی تاثر کی تلاش میں ان کا رویہ تخلیق کے پرانے معیاروں کے خلاف ہی رہا ۔ ان کے اس کارنامے کی طرف سب سے پہلے عبدالرحمن بجنوری نے یہ کہہ کر توجہ دلائی تھی کہ "جہاں غالب نے الفاظ میں نادر اور شستہ تصرفات سے کام لیا ہے وہیں تشبیہات اور استعارات میں بھی عام پابندی سے گریز کیا ہے"گویا اس معاملے میں غالب نے روایت سے ہٹ کر اپنے لیے الگ راہ تلاش کی ہے اور "اپنے آپ کو کسی تنگ دائرے میں مقید نہیں کیا اور بڑی خوبی سے موئے آتش دیدہ کو زنجیر سے دانہ ہائے تسبیح کو صد دل عشاق سے خانہٴ مجنوں کو گرد بے دروازہ سے بہار کو حنائے پائے خزاں سے دام موج کو حلقہٴ صد کام نہنگ سے دریا کو زمین کے عرق انفعال سے سرمہ کو دود شعلہ آواز سے نالہ کو گردش سیارہ کی صدا سے صبح وطن کو خندہٴ دنداں نما سے موئے شیشہ کو دیدہٴ ساغر کی مژگاں سے آئینہ کو ورطہ سے موج شراب کو مژہٴ خوابناک سے ساغر کو متاع دستگراں سے مماثل بیان کیا ہے ۔"

غالب کی شخصیت پر خارجی اور داخلی ہر اعتبار سے غم افسردگی اور تنہائی کی کہر چھائی ہوئی ہے ۔ ان کے تفکر میں غم جاناں اور غم دوراں دونوں قسم کے تجربے موجود ہیں ۔ طبعاً رومانی ہونے کے ناطے سے انہوں نے زندگی کی سنگین حقیقتوں سے کبھی منہ نہ موڑا بلکہ رنج سے خوگر ہو کر وہ حقیقتوں کے اور قریب آگئے اور ان کی تلخیاں رومان سے مملو نظر آنے لگیں ۔ مسائل حیات کا تجزیہ کرنے اور اس کے بارے میں کوئی واضح نقطہٴ نظر پیش کرنے کی بجائے رومان پرستوں کی طرح غالب بھی داخلی تاثرات کو اپنی فکر کا موضوع بناتے رہے ۔ وہ بات کو الجھا کر لیکن نہایت مرصع اور آراستہ انداز میں پیش کرنے کے عادی تھے ۔ رومانی شعراء میں سے کوئی بھی ایسا نہیں گذرا

جس نے اظہار کی دقتوں کے پیش نظر نامانوس پیرایۂ اظہار کا سہارا نہ لیا ہو اور اس کے ہاں ابہام نہ پایا جاتا ہو ۔ غالب نے بھی حسن خیال کو حسن اظہار پر ترجیح دی ان کا منفرد اسلوب ان کی اپنی رومان آمیز اجتہادی قوتوں اور تجربوں کا حاصل تھا ۔ اس سے ان کے اظہار میں بے شک تجریدیت کا پہلو نمایاں ہوگیا لیکن آنے والی نسل کے لیے ان کے ابہام کو ایک برجستہ اسلوب کا درجہ حاصل ہوا ۔

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

انسانوں سے محبت کرنے کی وجہ سے غالب کی غزلوں میں ایک زیریں انبساطی لے ضرور پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے اظہار پر خود بخود رومانیت کی پرچھائیں پڑنے لگتی ہیں ۔ اپنی قلبی کیفیتوں کے ابلاغ کی خاطر عام رومان پرستوں کی طرح وہ اظہار کی نئی راہیں تو نہ تراش سکے مگر اپنی پیشکش کے انداز میں ایک انفرادیت انہوں نے ضرور پیدا کر لی ۔ مثلاً اندوہ سے نشاط کے تصور کی نمو ، خوبصورت خیالات کے لیے خوبصورت الفاظ اور مصورانہ پیرایۂ اظہار حسی تشبیہات کی تخلیق ، الفاظ میں نادر تصرفات اور وزن و آہنگ میں شادابی ، شگفتگی اور نغمگی کا احساس ، علامت رمزیت اور اشاریت کے استعمال کا تجربہ ، مخفی حقیقتوں کے اظہار اور ابلاغ کے لیے نئے زاویوں کی ترویج اور فکر آفریں ذہانت کا اظہار ، الفاظ میں موسیقی اور معانی میں دلآویزی اور عشق کی جنسی اہمیت کا ذکر ۔ ایک طرح سے ان کے ہاں غنایت موسیقی اور مصوری ساری چیزیں جمع ہوگئی ہیں اور اس صفت میں وہ اردو شاعری میں اپنی مثال آپ بن گئے ہیں ۔ دراصل اظہار کی نئی راہوں کی تلاش میں ان کے لیے روایت سے مکمل بغاوت کرکے ماضی سے یکسر منقطع ہو جانا ممکن ہی نہ تھا اس کے باوجود ان کے فنی تجربے بلا کا جرأت مندانہ اقدام قرار دیے جا سکتے ہیں ۔ ہر رومانی ذہن کی طرح ماضی سے محبت

رکھنے کے باوجود انہیں زندگی کے امکانات پر پختہ یقین تھا ۔ آئین اکبری کی تقریظ لکھتے ہوئے یہ بات ان کے ذہن میں بالکل واضح طور پر موجود تھی ۔ روایت کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے غالب نے غزل کے پیکر پر شک کا اظہار ضرور کیا ہے اور ان کا یہ اظہار جو ایک اعتراف بھی ہے اپنے عہد کی بہت بڑی ادبی جرأت ہے

بقدر ذوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

بے شک غالب کی تمام تر غزلیں ان کے رومانی رویے کا اظہار ہیں مگر ان کی مشہور غزل 'آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک' رومانی اظہار کی بھر پور مثال اور غالب کی رومانی افتاد کی صحیح نمائندہ ہے ۔ اسی طرح لذت پرستی اور رومانیت کے گہرے اثرات سے مملو غالب کی وہ غزل بھی ہے جس کا مطلع ہے :

کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی

غالب کے ہاں تکمیل خواہشات اور تسکین ذات کا ایک مسلسل اور مستقل رجحان پایا جاتا ہے ۔ وہ جذباتی خلوص جو معاشی افتاد سے وابستہ ہے ان کے ہاں بھی موجود ہے ۔ اس بھری پڑی اور خوبصورت دنیا کو جب وہ انسان پر تنگ دیکھتے ہیں تو غالب رومانیوں کی طرح تڑپ اٹھتے ہیں ۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

غالب اردو کے فکری سرمایے میں وہ پہلے رومانی ہیں جنھوں نے اپنے آس پاس کے افکار و نظریات اور عقائد و رجحانات کا نہ صرف جائزہ لیا بلکہ ان سے اختلاف کی جرأت بھی کی کیونکہ وہ مزاج اور افتاد طبع کے اعتبار سے بغاوت پسند اور کسی قدر انقلابی تھے چنانچہ ان کے ہاں حقیقت کا اظہار مادی صورت میں ہوا ہے مذہب ان کے لیے باعث تسلی تو ضرور ہے لیکن وجہ اطمینان کبھی نہ ہو سکا ۔

بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

مذہب اور مابعدالطبیعات کی وہی فضا جو رومانیت کا حصہ ہے ان کے ہاں بھی موجود ہے ۔ مذہب کے رسمی پہلو سے وہ سراسر بے تعلق تھے بلکہ بقول خلیفہ عبدالحکیم

''کسی ارضی مذہب کے پابند نہ تھے۔''

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

انہوں نے خدا کو بھی مادی روپ ہی تلاش کیا اور اسے زندہ اور فعال دیکھنا چاہا۔

ساغر جلوۂ سرشار ہے ہر ذرہ خاک
شوق دیدار بلا آئینہ ساماں نکلا

اپنے ہم عصروں سے غالب کو یہی شکایت رہی کہ وہ مذہبی انتہا پسندی، غلو اور عصبیت کا شکار تھے۔ اس معاملے میں ان کا اپنا ذہن کسی قسم کے مبالغے یا تعصب سے ماوراء تھا۔ ان کا انداز نظر آفاقی ہے۔ مذہب اور قومیت کے معاملے میں انہوں نے کبھی عصبیت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یہ تو نہیں کہ ان کے ہاں مذہب سے علیحدگی یا بے زاری کا رجحان پایا جاتا ہو لیکن مذہب میں غلو کو ان کی فطرت کبھی قبول نہ کرسکی۔ مذہب کے ساتھ منسوب جملہ غیر ضروری عناصر سے واضح کنارا کشی ان کی بہت حد تک انقلابی جرأت ہے۔ اس بات پر وہ بڑے خلوص کے ساتھ معذرت خواہ ہیں کہ ان کا مزاج فطرت کے حسن اور مادی راحتوں کا قدر شناس ہے لیکن ان کا دین عزی ہے:

رموز دیں نہ شناسم درست و معذورم
نہاد من عجمی و طریق من عربی ست

غالب کو اس حیات چند روزہ کے بعد کا بے کنار سمندر دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے وہ دیانت داری سے اپنی حسرتوں اور آرزوؤں کی تکمیل یہیں چاہتے ہیں۔ اس ذہن اور اس زندگی سے بڑھ کر ان کے لیے کوئی اور جنت نہیں۔ روایتی مذہب کے معاملے میں ان کا ذہن دیگر تمام مسلمہ رومانیوں کی طرح تشکیک کا شکار تھا۔ تاہم وہ ایسے وسیع القلب تھے ان کا مسلک احترام آدمیت اور انسان دوستی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان کی دوستی اور شاگردی کا دائرہ ہندوؤں سکھوں اور مسلمانوں سب کے لیے وسیع تھا خود کہتے ہیں کہ ''میں بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔'' علاؤالدین خاں کو ایک خط میں نہایت دردمندی سے لکھا ''قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں ان میں سے بقدر ہزار ایک (ہزارواں حصہ) ظہور میں نہ آئے نہ وہ دست گاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم نہ سہی جس شہر میں رہوں اس میں ننگا بھوکا نظر نہ

آئے۔'' عام رومان پرستوں کی طرح غالب کا دین بھی دین فطرت ہے۔ ایک خط میں انھوں نے لکھا ''میں ایک خالص موحد اور سچا مسلمان ہوں'' اگر وہ مسلمان تھے تو ان کا اسلام بھی وہی اسلام تھا جو دین فطرت ہے۔ اگر وہ عمر بھر ظواہر اور رسمیات کی پابندی سے گریزاں رہے تو یہ بھی ان کی شخصیت کے ٹھیٹھ رومانی روپے کا اظہار تھا:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

احمد ندیم قاسمی

فکر و فن کا بے مثال امتزاج ۔ غالب

ہجوم فکر سے دل مثل موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

فکر و فن کے ایک متوازن اور حسن امتزاج کے ذکر سے پہلے میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ''فن محض'' سے بھی ایک خاص سطح کی دلآویز شاعری تخلیق کی جا سکتی ہے مگر ''فکر محض'' شاعری کی نفی ہے ۔ اردو کے اکثر کلاسیکل شعراء کے کلام کا بیشتر حسن ان کی فنی مہارت سے عبارت ہے ۔ وہ بالکل سامنے کی سادہ سادہ باتوں کو بھی ایسے انداز سے شعر کی صورت دیتے ہیں کہ سننے والا جھوم اٹھتا ہے ۔ ہم نے اس سادگی کو محاکات کا نام دے رکھا ہے ۔ اور مجھے تسلیم ہے کہ محاکات بھی ہمارے کئی جمالیاتی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں ۔ مگر انسانی زندگی بیحد متنوع اور انسانی ذہن بے حد پر اسرار ہے ۔ وہ جہاں ''پاس ناموس عشق'' کی خاطر ضبط گریہ کرتا ہے وہاں انسان اور کائنات کے رشتوں پر بھی غور کرتا ہے ۔ پہلے وہ کائنات کی بیکرانی پر محض حیرت کا اظہار کر کے رہ جاتا تھا مگر پھر اسے ان رشتوں کا سراغ لگانے کی سوجھی اور یوں فکر کا آغاز ہوا ۔ دراصل فکر بجائے خود شاعری ہے مگر وہ جب معرض اظہار میں آتا ہے تو دلیل و منطق کے سانچوں میں ڈھل کر ایک الگ علم بن جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شاعر ''فکر محض'' کے زیر اثر آ جائے گا تو اس کے کلام میں سے ذہن و دل کو گرفت میں لینے والی وہ طلسماتی کیفیت غائب ہو جائے گی جو شعر کو شعر بناتی ہے اور تتر کے اس ٹکڑے ''دنیا فانی'' اور غالب کے اس مصرعے

ع خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

کے درمیان امتیاز پیدا کرتی ہے - نثر کے جملے میں "علم" ہے مگر مصرعے میں "کیفیت" اور شاعری ایک کیفیت ہی کا نام ہے - اردو شاعری میں غالب فکر و فن کے اس متوازن امتزاج کا بے مثال نمائندہ ہے - غالب کے زمانے میں فکر کی انتہا تصوف تھی - چنانچہ اس کے کلام کا فکری عنصر بھی زیادہ تر مسائل تصوف ہی کے شاعرانہ اظہار پر مشتمل ہے - مگر غالب کو ساتھ ہی یہ عرفان بھی حاصل ہے کہ

ع میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

غالب اپنے عصر کے مسائل سے نہ صرف آگے بڑھ کر سوچتا ہے بلکہ وہ ترک دنیا کی بجائے اپنے عصر کے حقائق سے بھی نمٹنے کی کوشش کرتا ہے - ظاہر ہے اپنے دور سے آگے بڑھ کر صرف وہی فنکار سوچ سکتا ہے جسے اس دور کے حقائق کا کماحقہ ادراک حاصل ہو جس میں وہ سانس لے رہا ہو - بصورت دیگر اپنے دور سے آگے بڑھ کر سوچنا بھی ایک نوع کا فرار بن جائے گا - سب فن کار اس مثالی دنیا کے پرستار ہوتے ہیں جسے انگریزی میں یوٹوپیا کہا جاتا ہے اور جسے ہم اپنی آسانی کے لیے "جنت موعودہ" قرار دے سکتے ہیں - اگرچہ یہ الفاظ یوٹوپیا کے لغوی معنی ادا نہیں کر سکے - سچا اور دیانت دار فن کار بہتر اور خوشگوار تر زندگی کا پرستار ہوتا ہے - اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی فن کار کو اپنے دور کے معیار حیات سے مطمئن نہیں دیکھا گیا - چنانچہ فن کار کو جب تک اپنے عصر تک کا مکمل شعور حاصل نہ ہو جب تک اسے حال کا عرفان حاصل نہ ہو وہ مستقبل میں جھانک ہی نہیں سکتا - غالب خود کو جس "گلشن نا آفریدہ" — جس خوب صورت مستقبل کا "عندلیب" قرار دیتا ہے وہ اس کے عصر کے آشوب کا صحیح رد عمل ہے - وہ حالات کے سامنے سپر انداز نہیں ہوتا - اگر وہ ایسا کرتا تو ایک نا آفریدہ گلشن کے خواب سے بھی محروم ہو جاتا - یوں وہ تصوف کے مسائل سے شغف رکھنے کے باوجود بے انتہا جری قسم کا حقیقت پسند شاعر ہے - بصورت دیگر وہ اس قسم کے اشعار کبھی نہ کہہ سکتا کہ

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلے

اور

تیری وفا سے کیا ہو تلافی ، کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

غالب کا فکر ایک ایسے شاعر کا فکر ہے جو حقائق حیات سے آنکھیں نہیں چراتا بلکہ ان سے پنجہ آزما ہوتا ہے - تب ایسے احساس ہوتا ہے کہ ان حالات کو بدلے بغیر

زیندگی حسن و شادابی سے بدستور محروم رہے گی "بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم" کا سا جذبہ اسی امنگ کی پیدا وار ہے ۔ اور اگر وہ ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ "رہیے اب اسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو" تو یہ جذبہ بھی اپنے دور کے حالات سے بے اطمینانی نے پیدا کیا ہے ۔ کوئی اور شاعر ایسی بات کہتا تو کہا جا سکتا تھا کہ یہ صوفیانہ ترک کا اظہار ہے مگر غالب کے کلام کا مجموعی اثر پیش نظر ہو تو اس کے سلسلے میں اس قسم کا شبہ کرنا بھی غلط ہوگا جو شاعر دہقان کے خون گرم کو برق خرمن کے ہیولے کی صورت میں دیکھ سکتا ہو اس کے بارے میں ایسا سوچنا بے انصافی ہے ۔ رہا یہ گلہ کہ ہمیں غالب کے ہاں انسان کی توانائی کا سراغ ذرا کم ہی ملتا ہے تو ایسا گلہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو غالب کو اس کے دور سے الگ کرکے دیکھتے ہیں ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایک ہزار سال کے تسلسل نے مسلمانوں کو بادشاہت کا عادی بنا دیا تھا ۔ وہ کسی بادشاہ سے بدگماں بھی ہوتے تھے تو اس کی جگہ صرف ایک نئے بادشاہ کی حد تک سوچ پاتے تھے اور عوام کی حیثیت محض "رعایا" کی تھی ۔ بیسویں صدی کی عوامی اور جمہوری تحریکوں کی روشنی میں انیسویں صدی کے ایک شاعر کا جائزہ لینا تنقید کا کوئی اچھا میعار نہیں ہے ۔ یہ تو وہ دور تھا جب غالب کا سا شاعر جسے اپنی عظمت کا پورا پورا احساس تھا بادشاہ وقت کی ناراضی کے خوف سے یہ تک کہنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ

ع کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

حالانکہ خود غالب نے کہا ہے کہ

ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

یہ وہ دور تھا جب لوگ اپنے دور کے آشوب کا مؤثر نقشہ کھینچنے کے لیے کہتے تھے کہ امراء در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں یہ خیال کسی کو نہیں آتا تھا کہ جو لاکھوں انسان اس آشوب سے پہلے در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے وہ کس حالت کو پہنچے ۔ اپنے دور سے غالب کی بے اطمینانی اتنی انقلاب آفریں نہیں مگر یہ کیا کم ہے کہ بے اطمینانی کی یہ رو اس کے پورے کلام میں جاری و ساری ہے ۔ اور میں تو یہ تک کہنے کو تیار ہوں کہ غالب نے جو "شاہ جم جاہ" کی طرف سے "دال" کے تحفے کا شکریہ ادا کیا ہے تو یہ ایک ایسا طنز ہے جس سے صرف وہی لوگ انکار کر سکتے ہیں جو اپنے آپ کو ماضی کے بادشاہوں کے درباریوں کا درجہ دیتے ہیں اور ان کے حضور کسی قسم کی گستاخی برداشت نہیں کر سکتے ۔

اس تفصیل کا مقصد صرف یہ ہے کہ غالب کا فکر کوئی منفی موشگافیوں پر اکتفا نہیں کرتا ۔ اس کا فکر حقیقت اور صداقت سے ربط قائم رکھتا ہے ۔ یوں غالب کا فکر زندہ فکر ہے کیونکہ وہ زندگی کا فکر ہے ۔ بلاشبہ وہ ''جنون کی حکایات خونچکاں'' لکھنے پر ہاتھوں کے قلم ہو جانے کی بات کرتا ہے مگر اس کا ''جنون'' اس کے زمانے کے مروجہ معیار عقل و ادراک کے خلاف ایک بغاوت ہے ۔ وہ بڑا باشعور دیوانہ ہے اور اسی میں اس کی عظمت ہے ۔ ایسے زندہ فکر سے آراستہ ہو کر سچ مچ کا شعر کہنا اکا دکا شاعروں کا ہی کام ہے ۔ یہ ایسی آزمائش ہے جس میں بعض اوقات اقبال تک پورا نہیں اترتا اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اقبال ایک پیغام کا ۔ایک ''مشن'' کا شاعر ہے اور غالب صرف شاعر ہے اور خدا کا شکر ہے کہ وہ صرف شاعر رہا ۔ اگر وہ اپنے فکر کو محض موزوں اشعار میں نظم کر دینے پر اکتفا کرتا تو اردو شاعری اپنے بہت بڑے سرمایہ فکر و فن سے محروم رہ جاتی ۔ یہ غالب ہی کا کمال ہے کہ جب انسانی زندگی ہر امید و توقع کی بھر پور اور اٹوٹ گرفت کا ذکر کرتا ہے تو کہتا ہے

پھونکا ہے کس نے گوش محبت میں اے خدا
افسون انتظار تمنا کہیں جسے

یہی وہ مقام ہے جہاں فکر و فن آپس میں یوں یک جا ہو جاتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کر دینا ناممکن معلوم ہونے لگتا ہے ۔

پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر
گورنمنٹ کالج کوئٹہ

مرزا غالب کے مقطعے

واہ رے غالب ! کیا جامع بسیط شخصیت تھی ۔ کتنے مختلف اجزا کا متوازن مجموعہ تھا ۔ ایک طرف یہی غالب ہمارے ماضی کا نوحہ خواں ہے تو دوسری جانب یہی ایک حسین ، لیکن روشن مستقبل کا پیامی ہے ! ایک وقت اگر در محبوب پر سجدہ ریزہ ہے تو دوسرے لمحہ میں بڑے بڑے نوابوں کے سجدوں کو ٹھکرا دیتا ہے ۔ ایک ہاتھ پر رندی کی قندیل ہے اور رندانہ ہاؤ ہو ہے تو دوسرے ہاتھ پر تصوف کی مشعل ہے ۔ اور وہ مجسم سبحان ربی الاعلیٰ بن کر ذات باری کی وسعتوں میں گم سم کھڑا ہے ۔

مرزا غالب کے مقطعے اُن کی زندگی کے مختلف النوع پہلوؤں کو پیش کرنے کے باعث خاصی اہمیت کے حامل ہیں ۔ عبدالرحمن بجنوری نے محاسن کلام غالب میں مرزا کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے کیا صحیح لکھا ہے کہ ''وہ کونسا نغمہ ہے ، جو ان تاروں میں خوابیدہ یا بیدار نہیں''۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقطعے اُن کی اپنی لکھی ہوئی داستان حیات ہے جسے شعری لباس پہنایا گیا ہو ، ان میں وہ علمی و ادبی نکتے بھی بیان کرتے ہیں ، اپنے دوستوں اور ممدوحوں کا ذکر بھی چھیڑتے ہیں ، گویا ان میں آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں کی چاشنی ہے ۔

مرزا غالب زمانے کی ناقدر دانی کی ہمیشہ شکایت کرتے رہے ، اُنہیں یہ شدید احساس رہا کہ زمانہ ان کے فن کی مناسب حوصلہ افزائی نہیں کر رہا اور جو تھوڑی بہت داد ملتی ہے وہ رسمی ہے ، چنانچہ گویا ہیں :

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

اور

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریٔ یاران وطن یاد نہیں

غالب کو قسمت نے خوشحالی عطا نہ کی ، وہ ہمیشہ اپنی ضرورتوں کے لئے دوسروں کے محتاج رہے۔ اپنی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں :-

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

حسن طلب ملاحظہ ہو ۔

غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

مرزا نے شہزادہ جواں بخت کا سہرا لکھا اس مقطع پر ہنگامہ برپا ہوا ۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھکر سہرا

بادشاہ اور اس کے اُستاد ذوق کو یہ بات پسند نہ آئی ، مرزا کو بادشاہ سے معذرت کرنا پڑی ۔

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

لیکن پھر اپنے لیے دیے رہنے کی عادت کو بھی رکھ گئے ۔

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

اُنہیں اپنی شخصیت کے دو رخ نظر آتے ہیں ۔

اے ساکنان کوچۂ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالب آشفتہ سر ملے

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

یہ تو سب جانتے ہیں کہ استاد ذوق اور مرزا غالب کے درمیان معاصرانہ چشمکیں چلتی رہتی تھیں ، ایک دفعہ غالب نے ذوق کو کوچے سے گزرتے ہوئے دیکھا تو مصرعہ پڑھا ۔

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا

ذوق نے سمجھا کہ ہم پر فقرہ کسا ۔

بادشاہ سے شکایت کی ، غالب بھی دور کی سمجھ بوجھ اور موقعے کی پہچان

رکھتے تھے ، ایک غزل کہی اور اس مصرعہ کو مقطع کا پہلا مصرعہ بنا دیا ۔

بنا ہے شہ کا مصاحب پھیرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

استاد ذوق کی وفات کے بعد غالب شاہ ظفر کے استاد ہوئے۔ اس سے پہلے وہ شاہی مورخین کے زمرے میں بمشاہرہ پچاس روپیہ داخل ہو چکے تھے کہتے ہیں :

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہ دیندار نے شفا پائی

اسی سلسلے کا ایک اور مقطع ہے ۔

غالب مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو
پیتا ہوں دھوکے خسرو شیریں سخن کے پاؤں

خسرو شیریں سخن میں لطف والی بات یہ ہے کہ دہلی کے عوام میں یہ مشہور تھا، حضرت امیر خسرو کے مزار پر جو کھرنی کا درخت ہے اسکی کھرنیاں کھانے سے آدمی خوش گو ہو جاتا ہے ، غالب نے امیر خسرو کے مزار پر جانے کی ضرورت محسوس نہ کی بلکہ اپنے شیریں سخن بادشاہ کے پاؤں دھو کر پی لینا ہی کافی جانا ۔

عارف مرزا کے عزیز اور چہیتے شاگرد تھے ، ان کے مرثیے میں کہتے ہیں ۔

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

تصوف سے لگاؤ کو یوں پیش کرتے ہیں ۔

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

یہ مقطع بہادر شاہ ظفر کی موجودگی میں پڑھا گیا۔ ظفر نے مقطع سن کر کہا کہ ہم تو اُس وقت بھی نہ سمجھتے ۔ غالب از راہ تفنن کہا کہ حضور تو اب بھی ویسا ہی سمجھتے ہیں ۔

غالب کو جوانی میں بقول اُن کے ایک ستم پیشہ ڈومنی سے عشق ہوا ، وہ زندگی کے نصف النہار میں ہی چل بسی ، مرزا کے دل پر چرکہ لگا ، ایک غزل

کبھی مقطع تھا

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی الفت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوق خواری ہائے ہائے

لگا تار محرومیوں کے تحت غالب کبھی کبھی غصے بھی ہوگئے ہیں اگرچہ اس غضب میں بھی کیفیت انفعال موجود ہے ۔ کہتے ہیں

زندگی اپنی جو اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ این بندہ خداوند نہ داشت

غالب نے اپنے اس شعر میں

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا ، اشارت کیا ، ادا کیا

محبوب کی بات کو بلائے جاں کہا ہے اور آسے تین حصوں یعنی عبارت ، اشارت اور ادا میں منقسم کیا ہے ، حقیقت میں یہی تین اجزا تغزل کے حقیقی عناصر ہیں ، اور اسکے اثر کا راز یہ ہے کہ عبارت ، اشارت اور حسن ادا کے رنگ سے تخیل اور جذبہ کی تصویر کشی کی جائے اور اگر ان میں سے ایک خوبی میں بھی بھداپن پیدا ہو جائے تو شعر نا تمام اور تاثیر سے مبرا ہوگا ۔ حسرت نے بھی غالب کے خیال کو یوں تقویت بہم پہنچائی ہے ۔

ہرحرف میں اس نامۂ رنگیں کے ہیں پنہاں
جدت کے ، عبارت کے ، اشارت کے لذائذ

شاعر کے دل کی گرمی اور شعلہ نوائی کا احساس ملاحظہ ہو ۔

سوخت عالم راحریر کلک من ، غالب منم
کاتش از بانگ نے اندر نیستاں انداختہ

وہ تصوف کے نہاں خانوں سے نکل کر ہنگامہ آرائی کی دعوت دے رہا ہے ، خانقاہوں کی تاریکیوں میں وہ ایک انوکھی شمع لیے آتا ہے ۔

غالب بہل تصوف و ہنگامہ گرم کن
نال قلم بہ شمع فروزاں برابراست

زندگی سے بیزاری کا اظہار شعرا کا ایک عام مضمون ہے لیکن غالب کا انداز بیان ملاحظہ فرمائیے ۔

در بغل دشتہ نہاں ساختہ غالب امروز
مگزارید کہ ماتمزدہ تنہا ماند

(ماتمزدہ میں جذبات کا ایک طوفان سمودیا گیا)

ایک مقطع میں کہتے ہیں تم مجھ سے میرا حال پوچھتے ہو شاید سمجھتے ہو کہ مجھ میں تم سے بات چیت کی تاب باقی ہے۔ آف! کتنی بے اتفاقی!!

جان غالب تاب گفتاری کجا نداری ہنوز
سخت بیدردی کہ میپرسی ز ما احوال ما

اپنی بیچارگی کی کیفیت کو ایک اور مقطع میں دلکش انداز میں بیان فرماتے ہیں ۔

خرسندی غالب نبود زین ہمہ گفتن
یکبار بفرمائے کہ ”اے ہیچکس ما“

غالب ایک بار شہر کے کوتوال کی دشمنی اور قسمت کی برگشتگی کے باعث قید فرنگ سے بھی دو چار ہوئے ، قید میں برا حال ہوا ، کپڑوں میں جوئیں پڑ گئیں ، رہائی کے بعد لباس بدلا تو یہ مقطع پڑھا ۔

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

غالب کہیں غم کی زیادتی کو برد باری سے برداشت کرتے ہیں ، جیسے ۔

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے
اُس کے سیل گریہ میں گردوں کف سیلاب تھا

کہیں وہ اس غم کو حضور صلعم کی دبستگی سے دور کرتے ہیں ۔

اس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا

اور پھر خدا پر بھروسہ کرتے ہیں ۔

بیگانگی خلق سے بیدل نہ ہو غالب
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

غالب کی ظرافت ذہنی طمانیت کا باعث ہوتی ہے مثلاً واعظ کی دو رنگی چالوں کی مذمت کونسا شاعر نہیں کرتا ، مگر غالب کا یہ شعر خمریات کے متعدد دفتروں پر بھاری ہے -

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

مرزا کی عمر کا زیادہ حصہ پنشن کے حصول میں صرف ہوا ، کچھ امراض میں کٹا ، آن کی زبان سے سنئے '' پیرانہ سری و ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی ، حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے -

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں

جب لگاتار کوششوں کا نتیجہ ناکامی کے روپ میں ظاہر ہوا ، ناسازگار حالات کے مقابلے کی تاب نہ رہی ، ولولے اور حوصلے سرد پڑ گئے ، صرف موت آنا باقی تھی ، ایک مقام پر لکھتے ہیں ''قتل ایسا عام ، لوٹ ایسی سخت، کال ایسا پڑا، وبا کیوں نہ ہو میرا ہی شعر اور میرے ہی حسب حال ہے -

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے''

آخر ایک روز زمانے کی سختیاں ، بے قدریاں اور جورٓ آفرینیاں تمام ہوئیں اور وہ عروس مرگ سے جس کے وہ عمر بھر چاہنے والے تھے ہم کنار ہو گئے -

سفینہ جب کہ کنارے پر آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جور نا خدا کہیے

مرزا غالب کا تصور عشق بھی ایک انمٹ جذبے کی یاد دلاتا ہے ، ایک ایسا جذبہ جو کسی عارضی شے کے وصال سے تسکین نہیں پا سکتا ، بلکہ اُس کی بے تابیوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ، چنانچہ جب مرزا موت کے بعد اپنے جذبۂ عشق کے ہر لحظ تازہ اور تیز تر ہونے کا ذکر کرتے ہیں تو آن کی مراد بھی یہی ہوتی ہے - فرماتے ہیں -

رسید نہای منقار ہا در استخوان غالب
پس از عمری بیادم داد رسم و راہ پیکانرا

اس شعر کو یوں بھی پیش کرتے ہیں -

خلیدن ہای منقار ہا در استخوان غالب
پس از مدت بیادم داد کاوش ہای مژگاں را

اور

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور تو جیئے ہوتے

نظیری جان کنی کے وقت اپنے محبوب کی زبان سے یہ سننے کا خواہشمند ہے کہ 'بمیر'

(اگر محبوب یہ کہہ دے تو آرزو بر آئی)

نظیری از تو بجان کندن است لب بکشائے
باین قدر کہ بگوئی بمیر ، خرسندست

مرزا غالب اپنی ایک فارسی غزل کے مقطع میں اس کے برعکس فقط اتنا جانتے ہیں کہ جب کوئی اُن کا حال پوچھے تو یہ جواب ملے ''بکر وفا ہے'' تو وہ اس پر شادان و فرحان ہوں ، غالب جس انداز میں اپنی وفا کی جانب اشارہ کر گئے ، وہ شنیدنی ہے ۔

نہ آن بود کہ وفا خواہد از جہان غالب
بدین کہ پرسد و گو یندہست ، خرسندست

مرزا فارسی اور اُردو کے جن شاعروں کا ذکر عزت اور احترام سے کرتے اُن میں بیدل ، ظہوری ، نظیری عرفی اور فغانی کے علاوہ میر بھی شامل ہیں ۔

بیدل کی طرز کی دشواریوں کا اس طرح اعتراف کرتے ہیں ۔

طرزبیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

میر کے اشعار جابجا غالب کے خطوں میں نظر آتے ہیں۔ عقیدت کا اظہار یوں ہوتا ہے ۔

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا تم سے
جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

بابا فغانی شیرازی (جو فارسی شاعری کے تیسرے دبستان کا بانی ہے) کے متعلق کہتے ہیں

پردہ چند بہ آہنگ نکیسا بسرای
غزل چند بہ هنجار فغانی بشنو

ظہوری سے متعلق ایک مقطع سنئے -

بہ نظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب
رگ جان کردہ ام شیرازہ اوراق کتابش را

غالب کے مقطعے ان کی شاعری کی منظوم تنقید ہوتے ہیں اور ان سے مرزا کے خیالات کا واضح علم ہو جاتا ہے مثلاً آن کے نزدیک سب سے پہلی خوبی جو ایک شاعر کے لئے ضروری ہے یہ ہے۔

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

وہ لفظوں کے مقابلے میں معانی کو ترجیح دیتے تھے ، دہلی کے مکتب فکر کا جھکاؤ ہمیشہ معانی کی طرف رہا ، غالب بھی اسی زمرہ میں آتے ہیں - غالب کے ہاں شاعری کا ذوق رسمی نہ تھا بلکہ فطری تھا ورنہ غالب غالب نہ ہوتے وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے -

ما نبودیم بریں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

مرزا غالب کے متعدد مقطعے آج بھی زبان زد خاص و عام ہیں ، خیال اور زبان کی خوبیوں نے ان کے اسلوب بیان کو ایک ممتاز مقام عطا کیا ہے - اس کا آنکو خود اس طرح احساس ہے -

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیان اور

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

شمیم عزیز

غالب اور بیدل

عہد عالمگیری شاعری کے لئے حد درجہ ناسازگار تھا ، عالمگیر درویش صفت انسان تھا اور جمالیات سے کوسوں دور ، اس کے لیے زندگی جہد مسلسل تھی اور بس۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں شاعری پھل پھول نہ سکتی تھی ، انتہا اس کی یہ تھی کہ شاعروں نے تنگ آ کر جب شاعری کا جنازہ اٹھایا تو بجائے اس کی حالت پر رحم کھانے کے عالمگیر نے اس مردے کو اتنا گہرا دفن کرنے کا حکم دیا کہ پھر نہ نکل سکے ، ایک انشاپرداز نے ان حالات کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

"اس کے دبدبہ اور ہیبت سے حسینوں کا خیال کافر کیش محراب ابرو میں مشغول نماز ہو گیا اور اس کے محکمہ قضا کے جلال سے خوش جالوں کے غمزہ خونریز کو حجرہ چشم میں جانشین ہونا پڑا"

آخر عالمگیر کی وفات پر یہ سکوت و جمود ختم ہوا ، تو مدت کے رکے ہوئے جذبات بے تابانہ پوری شدت سے بہ نکلے۔ اردو کا یہ ابتدائی دور سادگی و سلاست کا دور تھا ، لیکن اس کے دوش بدوش فارسی شاعری اپنی تمام تر فنی نزاکتوں کے ساتھ موجود تھی ، اور صنائع بدائع کا استعمال اس میں حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا ، اور بڑے بڑے استاد عبدالقادر، بیدل اور ناصر سرہندی تھے۔ فارسی شاعری کے ضائع بدائع کی بھول بھلیوں نے اردو شاعروں کو بھی متاثر کیا ، چنانچہ میر و سودا سے پیشتر کے شعراء آرزو ، حاتم ، ناجی ، مضمون ، یکرنگ وغیرہ نے ان کو خاص اہمیت دی ، مگر خوش بختی سے بہت جلد ان کو اس کوتاہی کا احساس ہو گیا اور یہ بدعت وہیں ختم ہوگئی۔ میرتقی میر اور سودا نے اردو غزل کو نیا اسلوب عطا کیا ، میر نے سادگی کی روایت قائم کی تو سودا نے صفائی زبان اور شکوہ الفاظ کے لئے راہیں استوار کیں ، یہ دونوں اسلوب ایک دوسرے کے متوازی چلتے رہے ، اور انیسویں صدی تک شاعری میں معمولی تغیرات کے سوا قابل ذکر بات نظر نہیں آئی ، انیسویں صدی میں بھی اگر مرزا غالب کی شخصیت نہ ہوتی تو آج اردو شاعری کی تاریخ بہت مختلف ہوتی ، غالب کو اردو شاعری میں ایک منفرد مقام حاصل ہے

وہ میر و سودا کی تقلید کی بجائے بیدل اور دوسرے فارسی شعراء کے تابع تھے۔ وہ میر کے معتقد ضرور ہیں مگر میر کے رنگ میں شعر کہنے کی تمنا ذوق کی طرح انہوں نے کبھی نہیں کی ، وہ فارسی اور فارسیت کے دلدادہ تھے ، اسی لیے ان کے پیش نظر بیدل ، عرفی ، اور نظیری تھے ، جبکہ دیگر اردو شعراء کی حد پرواز زیادہ سے زیادہ ولی تک محدود تھی ، یہی وجہ ہے کہ غالب کے خیالات میں تنوع اور وسعت ملتی ہے

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خان قیامت ہے

اپنی جدت پسند طبیعت کے باعث وہ عام روش سے الگ رہنا چاہتے تھے ، اور ان کا آدرش ایک صدی پیشتر کے فارسی شعرا تھے جن میں بیدل سے وہ خاص طور پر متاثر نظر آتے ہیں ۔ بیدل کی بلند خیالی اور نکتہ آفرینی سے انہیں ، والہانہ لگاؤ تھا ، اور اپنی اسی ذہنی نہج کی وجہ سے وہ بیدل سے قریب ترہیں ، اور اردو میں شعر کہتے وقت بھی وہ اردو فارسی میں تمیز نہیں کر پاتے۔

بیدل میں جو چیز سب سے زیادہ ان کو متاثر کرتی ہے وہ تحلیل وتجزیہ کی اپج ہے ، اور اس کا اعتراف خود انہوں نے بھی کیا ہے ۔

اسد ہر جا سخن میں طرح باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگ بہار ایجادی بیدل پسند آیا

یہ رنگ بہار ایجادی کیا ہے ، خیال بندی اور وہمی چیزوں کا تجزیہ و تحلیل ۔ ایسی چیزیں جو خارجی عالم میں نظر نہیں آتیں ، تحلیلی شاعری کا معراج کمال بلاغت ہے ، لیکن جب یہ انتہا تک پہنچ جائے تو مہمل ہو جاتی ہے ۔ غالب کے ابتدائی دور کے کلام کا لامحالہ یہی حشر ہوا تھا ۔ حالات و زمانہ کے تقاضوں کے پیش نظر گو غالب نے طرز بیدل سن شعور تک پہنچتے پہنچتے ترک کر دیا تھا مگر برسوں کی مشق سخن کے بعد بھی وہ اپنے طبعی میلان کی وجہ سے مکمل طور پر خود کو بیدل کے سحر سے آزاد نہ کر سکے اور ان کے دور پختگی کے کلام میں بھی بیدل کی صداؤں کی باز گشت گونجتی ہے ، بیدل کا ایک شعر ہے ۔

تاپہ کے بے مدعا چوں شمع باید سوختن
جادۂ خود را نہ سازی محو در منزل چرا

اور غالب نے کہا تھا -

رنج رہ کیوں کیجئے واماندگی کو عشق میں
اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

غالب کا مشہور شعر ہے -

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اب بیدل کا شعر ملاحظ ہو -

بر ہستی تو امید است نیستی مارا
کہ گفتہ اند اگرہیچ نیست اللہ است

یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی آواز دونوں اشعار میں گونج رہی ہے -

دوسری چیز جس نے غالب کو بیدل کی طرف متوجہ کیا اس کے فلسفیانہ افکار اور موشگافیاں ہیں ، چنانچہ دور اول میں پیچیدگیوں کا باعث یہی فلسفیانہ اموررہیں ، اور ہم دیکھتے ہیں کہ جہت سے فلسفیانہ تصورات و خیالات غالب نے بیدل سے اخذ کیے -

ایک اور قدر مشترک دونوں فنکاروں میں آزادہ روی اور خود بینی ہے - یہی خود بینی اور شان استغنا تھی جس نے غالب کو بر عزم بنا کر، حوادث روزگار کے مقابل کھڑا کر دیا اور ان کو کونسی بلندی کے احساس نے ذہنی قنوطیت سے بچالیا۔ بیدل کے یہاں یہ شان استغنا ہمیشہ قائم رہی -

آخر ز فقر برسر دنیا زدیم پا
خلقے بجاہ تکیہ زد ما زدیم پا

جبکہ غالب پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ زندگی کے آخری ایام میں وہ اس شان استغنا سے عاری نظر آتے ہیں - لیکن معترضین یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ بیدل اور غالب کے زمانے ایک دوسرے سے کس قدر مختلف تھے - بیدل کا زمانہ اورنگ زیب عالمگیر کا زمانہ تھا جبکہ غالب کو بہادر شاہ ظفر کا دور ملا ، چنانچہ جو فرق عالمگیر کے ہندوستان اور ظفر کے ہندوستان میں ہے وہی فرق ان شاعروں کی زندگی میں نمایاں ہے -

غالب بیدل سے متاثر ہونے کے باوجود مکمل طور پر ان کے رنگ میں رنگے نہیں گئے - بلکہ اپنی انفرادیت کو بھی برقرار رکھا ہے - مثلاً بہشت پر بیدل اور غالب

دونوں نے اعتراض کیا ہے ۔ مگر دونوں کا انداز جداگانہ ہے ۔ بیدل تو بہشت میں بھی اقبال کی طرح ہنگاموں کے متلاشی ہیں ۔

گوئیند بہشت است ہمہ راحت جاوید
جائے کہ بہ دامنے نہ تپد دل چہ مقام است

لیکن غالب جنت میں کسی اور چیز ہی کے خواہاں ہیں ۔

جنت نہ کند چارہ افسردگیٔ دل
تعمیر باندازہ ویرانی ما نیست

بیدل کے نزدیک زندگی مسلسل حرکت اور عمل پیہم کا نام ہے جبکہ غالب سکون و راحت کے دلدادہ ہیں ۔ علامہ اقبال نے صحیح کہا تھا ۔

''غالب اور بیدل کی صوفیانہ شاعری میں بہت فرق ہے ۔ بیدل کے تصوف میں حرکت ہے اور غالب کا تصوف مائل بہ سکون ہے''

لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ یہ ذوق سکون خصوصیت کے ساتھ اس وقت وارد ہوا جب غالب نے بیدل کی تقلید ترک کردی ۔ ورنہ دور اول میں اس قسم کے اشعار کی کمی نہیں ۔

نہ ہوگا یک بیابان ماندگی سے ذوق کم میرا
حباب موجہ رفتار ہے نقش قدم میرا

بیدل کی تقلید اقتضائے زمانہ کی وجہ سے غالب نے بہت جلد ترک کردی ۔ انھوں نے اسے اختیار کیا تھا محض اپنی ندرت پسندی کی وجہ سے ۔ عام روش سے ہٹ کر چلنا ان کی سرشت تھی ۔ اور تحلیل و تجزیہ کی قابلیت خداداد ۔ اسی صلاحیت نے ان کو فلسفہ کی طرف مائل کر دیا تھا ۔ چنانچہ شاعری کے آغاز کے وقت ان کو یہ صفات بیدل ہی میں نظر آئیں اور وہ بے اختیار اسکے قریب تر ہو گئے ۔ دور اول میں خصوصیت کے ساتھ بیدل کی خیال بندی ، مصنوعی پن اور بے کیف دماغی ورزش ملتی ہے ۔ مگر یہ مشق غالب کے لیے بہر صورت مفید رہی ۔ نازک خیالی اور معنی آفرینی کے کمال کی ابتداء یہیں سے ہوئی اور الفاظ وصوت کی صنعت گری خلاقئی فکر کے حسین امتزاج کا پیش خیمہ بھی یہی مشق تھی البتہ دور اول کا مصنوعی جال بعد ازاں حقیقت کے حسن لازوال سے بدل گیا تھا ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ غالب فطرت انسانی کے نباض ہوگئے تھے ۔ اور بیدل کی مصنوعی دنیا سے ان کی دلچسپی کم ہوگئی تھی ۔ لیکن بیدل کی خلاقی سے ان کو ہمیشہ دلچسپی رہی ۔ جس کا ثبوت ان کے کلام کی انتہائے بلاغت ہے ۔ حد درجہ بلیغ تراکیب ، نادر و حسین تشبیہات و استعارات ایسے ہیں جو بیدل سے افضل تر سہی مگر ان کا منبع بیدل ہی ہے ۔

رانا محمد سرور ایم - اے

غالب کا مزاح
(اردو دیوان کی روشنی میں)

حالی نے غالب کو ''حیوان ظریف'' کہہ کر ان کی فطرت کو بے نقاب کر دیا ہے۔ ظرافت ان کے مزاج کا ایک ایسا بنیادی عنصر ہے جس کے کرشمے ان کے کلام ونثر قدم‌قدم پر ضیافت طبع کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ خطوط میں ظرافت کا رنگ ذرا زیادہ ہی شوخ ہو گیا ہے - اس کے برعکس فارسی دیوان نسبتاً زیادہ سنجیدگی کا حامل ہے - یہاں ہم ان سب سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف اردو دیوان کی روشنی میں ان کے مزاح کا جائزہ لیں گے - اگرچہ انہوں نے اپنے مجموعہ اردو کو بے رنگ کہہ کر پکارا ہے ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں مزاح کے ایسے گلہائے رنگین کھلے ہیں جو طبیعت کو باغ باغ اور مشام جاں کو معطر کرتے ہیں -

مزاح غالب کی طبیعت میں اس طرح رچا ہوا ہے کہ جدا کرنا محال ہے - یہاں تک کہ ان مقامات پر بھی جہاں وہ حزن و یاس کا بیان کرتے ہیں مزاح کی جھلکیاں ضرور دکھائی دیتی ہیں - غالب بنیادی طور پر رنج و الم اور درد و داغ کے شاعر ہیں - فلک کج نہاد کا شکوہ ، ابنائے روزگار کی شکایت ، حال سے بے اطمینانی اور مستقبل کی آرزو مندی ، کردہ گناہوں کی سزا اور ناکردہ گناہوں کی حسرتیں ، سب کا بیان بڑے بھرپور انداز میں ملتا ہے - لیکن اس سے بھی انکار نہیں کہ محرومیوں اور حسرتوں کے اس پر شور اظہار کی بالائی سطح کے نیچے شگفتگی کی آہستہ خرام رو نمایاں طور پر نظر آتی ہے - اس کی عمدہ مثال غالب کی یہ غزل ہے - جس میں لطیف مزاح اپنی انتہا پر ہے -

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

غالب کے ہاں حزن و یاس کی فراوانی ہے - لیکن وہ اس شخص کی طرح جس نے اپنے اقران و امثال کی نسبت غم روزگار سے زیادہ حصہ لیا ہو اور جس پر اتنی مشکلیں پڑی ہوں کہ آہستہ آہستہ وہ ان کا خوگر ہو چکا ہو - ایک روشن دماغ ہمدود بن کر ہماری صحبتوں میں شادابی اور شگفتگی کا تحفہ لاتے ہیں - تنہائی میں ان کے آنسوؤں میں لاکھ درد کی کسک ہو لیکن دوسروں کے سامنے آکر ان کے آنسو مسکرانے لگتے ہیں - وہ میر کی طرح منہ بسورنا نہیں جانتے - زمانے کی ستم ظریفی اور شکست آرزو کا غم بھی ان کے چہرے سے بشاشت نہیں چھین سکتا - میر کے لئے غم ہی زندگی ہے - لیکن غالب غم کو زندگی کا صرف ایک حصہ سمجھتے ہیں - وہ غم آشنا ضرور ہیں لیکن غم پرست نہیں - یہی چیز انہیں میر سے ممتاز کرتی ہے - حقیقت یہ ہے کہ رنج و الم کے بیان میں بھی شگفتگی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی - جب وہ کہتے ہیں -

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیہ طوفاں کئے ہوئے

تو اس سے ہمارے دل پر اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا مثلاً انشاء کے اس شعر سے ہوتا ہے -

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

غالب کے شعر سے غم و اندوہ کی وہ کیفیت طاری نہیں ہوتی جس کی توقع عموماً حزنیہ شاعری سے کی جاتی ہے -

ویرانیوں میں کھو کر بھی ان کی زندہ دلی نہیں جاتی - وہ مصائب کو ''بر پشم قلندر'' کہتے ہوئے غم کی ناکامی کا مذاق اڑاتے - اور اسی سے مزاح پیدا کرتے ہیں - غالب نے اپنی جدت طرازی سے غم کو بھی زندہ دلی اور شگفتہ روئی کی مدد سے شاداب بنا لیا - وہ غموں کی چکی میں پستے ہیں لیکن ہار نہیں مانتے - وہ زندگی کے اس کھیل کو بڑی مردانگی سے کھیلتے ہیں -

بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیوں کیجئے ہائے ہائے کیوں

غالب کا زمانہ سیاسی کشمکش اور معاشی ابتری کا زمانہ تھا - وہ بلند مرتبہ

تہذیب جسے اس ملک کے لوگوں نے خون جگر سے سینچ کر پروان چڑھایا تھا خزاں کی تاخت و تاراج کی زد میں تھی - اور اس کی جگہ ایک ایسی تہذیب آ رہی تھی جس کے خط و خال ابھی پوری طرح نمایاں نہیں ہوئے تھے - پرانی اقدار جن کی محبت خون کی طرح ان کے رگ و ریشے میں سما چکی تھی - نئی اقدار کے لئے جگہ خالی کر رہی تھیں - نئی اور پرانی تہذیب کی اس ٹکر اور اقدار کے اس تصادم نے ایسے شکوک و شبہات کو جنم دیا جو ہر ذہن کو ڈستے ہیں - خاص طور پر ایسے شخص کے ذہن کو جس میں سوچ کا مادہ عام لوگوں سے بڑھ کر ہو - لیکن یہ غالب کی عظمت کی دلیل ہے کہ وہ ان میں الجھ کر مایوسی اور بے بسی کا شکار نہیں ہو جاتا - بلکہ اپنی خدا داد ذہانت اور فراست کی بدولت ان کی تہہ تک پہنچ کر ان کے بودے پن کو سمجھ لیتے ہیں - اور ان کا مذاق اڑا کر مزاح کی ضیافت خوش ذائقہ کا سامان مہیا کرتے ہیں -

غالب تفکر کے عادی ہیں - واردات و جذبات انسانی کے طوفان قیامت خیز کا بیان ہو یا فطرت کائنات کے سر بستہ رازوں کی گرہ کشائی ان کے ہاں ہر جگہ سوچ کا عنصر غالب ہے - لیکن خشک مفکرانہ سنجیدگی نام کو بھی نہیں - وہ اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہیں - کہ کسی چیز کی حقیقت پر غور کرتے وقت اس کے تبسم زا پہلو پر بھی نظر رکھیں - سنجیدگی اور مزاح کا یہ حسین امتزاج ہی کلام غالب میں بڑھی ہوئی دلچسپی کا باعث ہے - ان کی اسی غزل پر نظر ڈالئے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے -

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

پوری غزل پڑھتے جائیے - یوں معلوم ہو گا جیسے تحقیق و تفحص کے ساتھ ساتھ مزاح کی ایک رو چل رہی ہے - ایک سیلاب نرم خیز ہے - جو آہستہ آہستہ بڑھتا چلا آتا ہے - آخر میں قاری کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے - آخری شعر میں نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے - کہ سنجیدگی کا وہ ہلکا سا نقاب بھی اتر جاتا ہے - اور پڑھنے والا کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے -

گرچہ کہتے ہیں کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

غالب اپنے مزاح سے اپنے لئے ہمدردی جیتتے ہیں - یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ لوگ ایسے شخص کو پسند کرتے ہیں جو مصائب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائے - وہ مصیبت میں یار غمگسار بنتے اور پریشان حالی میں تسکین

بخشتے ہیں۔ وہ اس راز سے آگاہ ہیں کہ اس دنیا میں غم کے ساتھ خوشی۔ خزاں کے ساتھ بہار اور تاریکیوں کے ساتھ روشنی بھی موجود ہے۔ انہیں یہ بھی پتہ ہے کہ ادب اگر زندگی کے ایک ہی رخ کو پیش کرے تو وہ ادب آفاق اور ہمہ گیر کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ یہی چیز ان کی شاعری کو کلاسیکی رنگ بخشتی ہے۔ غالب کا مزاج ان کی رجائیت کا آئینہ دار ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں غالب ان اقدار پر چوٹ کرتے ہیں جو ان کے ذہن و قلب سے ہم آہنگ نہیں۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ جہاں موقع ہوتا ہے وہ خود کو بھی معاف نہیں کرتے۔ دنیا کو تو آئینہ دکھاتے ہی ہیں۔ اپنے آپ کو بھی آئینہ دکھانے لگ جاتے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

ہو گا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں تو کہتے ہیں
کہ ''آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں''

غالب کی شوخی داغ کی شوخی نہیں جو تماش بینی کی ایک ضمنی پیداوار ہے۔ وہ خود حسن و عشق کی داستان کا ایک کردار بنتے ہیں۔ اور پھر اپنے آپ پر، اور کاروبار عشق کے قابل گرفت پہلوؤں کا مذاق اڑا کر ظرافت کی تخلیق کرتے ہیں۔

عشق پیشہ حضرات محبوب کی ناز برداریاں کرتے ہیں۔ اور محبوب کے مقابلے میں اس حد تک اپنی تحقیر و تذلیل پر اتر آتے ہیں کہ محبوب کا کتا کہلانے پر بھی فخر محسوس کرتے ہیں۔ غالب بھی محبوب کے پاؤں دھو دھو کر پینا چاہتے ہیں (یہ الگ بات ہے کہ محبوب ضد سے اپنے پاؤں کھینچ کر لگن سے باہر رکھتا ہے) لیکن جب وہ عجز و نیاز سے راہ پر نہیں آتا، تو اس کے دامن کو حریفانہ کھینچنے لگتے ہیں۔ عادت سے مجبور ہیں۔ لہذا رگ ظرافت بھڑکتی ہے تو محبوب سے شوخی بھی کر بیٹھتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تمسخر و استہزا تک نوبت پہنچ

چاق ہے ۔ اس وقت تو یوں معلوم ہوتا ہے ۔ جیسے غالب اسے کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں ۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان کا محبوب ہے بھی اسی واسوختی رویے کا مستحق ، ہرجائی ، آوارہ گرد اور وعدہ فراموش جو ٹھہرا ۔

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو اسے یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

اور ذرا یہ تعریف بھی سن لیجیئے ۔

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں
بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کئے

کتنا جھگڑالو ہے اس کا بیان غالب کی زبان سے سنئے ۔

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنی مدت میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

بے محابا قتل کرتا ہے ۔ یہاں تک کہ اگر ہمارا پیغام خلاف منشا ہو تو قاصد کی اپنے ہاتھ سے گردن مار دیتا ہے ۔ کیا خوب طنز ہے ۔ شوخی ملاحظہ ہو کہ عشق میں بھی سنجیدہ نہیں اور کہتے ہیں منہ دکھلانا نہیں چاہتے نہ سہی ذرا پردہ اٹھا کر عتاب کے لئے آنکھیں ہی دکھا دو ۔

منہ نہ دکھلاوے ، نہ دکھلا ، پر بانداز عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

وہ محبوب کے انداز گفتگو کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں ۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تم ہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

عرض نیاز اور بظاہر مودب طریق اظہار میں بھی شوخی نظر آتی ہے ۔

بے نیازی حد سے گزری ، بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرماویں گے ''کیا''؟
ہوئی تاخیر ، تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

محبوب کی طرح دو اور بھی بد نصیب ہیں جو ان کے طنز کا نشانہ بنتے ہیں - یعنی حضرت ناصح اور درباں -

ناصح پر تو وہ خاص طور پر مہربان ہیں - کہیں اس لئے اس پر طنز کے تیر برساتے ہیں کہ وہ ریاکار ہے - جن کاموں سے غالب کو منع کرتا ہے خود چھپ چھپ کر وہی کام کرتا ہے - کبھی اس لئے اس کا مذاق اڑاتے ہیں کہ وہ انہیں عشق بازی سے روکتا ہے - ناصح غالب کو قید کرتا ہے - اس کے باوجود وہ جنون عشق کے انداز چھوڑنے پر رضامند نہیں ہوتے اور ہل من مزید کا نعرہ لگاتے ہیں - ناصح تو رہے ایک طرف وہ مسیحا کو بھی نہیں بخشتے -

زہاد پر طنز بوجہ ریاکاری و دغل و فریب اردو فارسی شاعری کی ایک مستقل روایت ہے - لیکن بعض اوقات ایسی اخلاق کمزوریوں سے قطع نظر ان کی عام بد ذوق کو ہدف ملامت بنایا جاتا ہے - غالب کے ہاں بھی کئی اشعار ایسے ہیں جن میں زاہدوں کی اس صفت پر طعن کیا گیا ہے مزے کی بات تو یہ ہے کہ بعض اوقات شوخی سے غالب اپنا قصور ان کے سر تھوپ دیتے ہیں مثلاً اس شعر میں -

کیوں رد قدح کرے ہے زاہد
مے ہے، یہ مگس کی قے نہیں ہے

شہد چونکہ جنت کی نعمت ہے اس لئے ایسے تو مے کے مقابلے میں اس کی تحقیر ممکن نہ تھی - لہذا اسے مگس کی قے کہہ کر زاہد شہد خور کو بد ذوق کا مرتکب قرار دے دیا ہے - کتنا سادہ اور معصوم طنز ہے - دو اور شعر دیکھیئے -

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

کہاں مے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

درباں کی شقاوت قلبی ضرب المثل ہے - غالب اسے کیسے معاف کر سکتے تھے - کہتے ہیں شاید رضواں بھی اتنا سخت گیر نہ ہو -

بعد یک عمر ورع ، بار تو دینا ، بارے
کاش رضواں ہی در یار کا درباں ہوتا

درباں سے انہیں اس لئے بھی چڑ ہے کہ وہ ان کا واقف ہے - اجنبی لوگوں کے درمیان ذلت شاید اتنی محسوس نہ ہو جس قدر جاننے والوں کے سامنے ہوتی ہے -

محبوب کے تحقیر آمیز سلوک کا انہیں کوئی غم نہیں - رنج صرف اتنا ہے کہ یہ سب کچھ دربان کی نظروں کے سامنے ہوتا ہے -

دے وہ جس قدر ذلت ، ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ، ان کا پاسباں اپنا

غالب بھیس بدل کر تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں - اور گدائی میں بھی دل لگی نہیں چھوڑتے -

چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے

اور تو اور وہ خدا کو بھی نہیں بخشتے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

غالب روزمرہ اور محاورہ کے استعمال سے بھی مزاح کا رنگ لاتے ہیں - درج ذیل شعر میں دیکھئیے کہ اپنی تحقیر ، خود سپردگی ، پر اصرار اور روزمرہ نے کس قدر شگفتگی پیدا کی ہے -

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

بعض اوقات اپنے پر مزاح استدلال سے شعر کو باغ و بہار بنا دیتے ہیں -

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادہ دوشینہ کی بو آئے

ذرا تخیل کی کارفرمائی تو دیکھئیے - کہ منکر نکیر ایسے ہی ڈر کر نہ بھاگیں گے - انہیں صرف منہ سے آتی ہوئی بادہ دوشینہ کی بو بھگا سکتی ہے - لہذا شراب نوشی کرنی چاہیے - کیا مزیدار دلیل ہے -

اگر انہیں مزاح کے لئے کوئی سامان مہیا نہ ہو تو وہ تصور کی مدد سے مزاحیہ سچوایشن پیدا کر لیتے ہیں - ایسے واقعات کی ان کے ذہن سے باہر اکثر کوئی حقیقت نہیں ہوتی - لیکن چونکہ ایسا ہونا امکان سے بعید نہیں ہوتا - اس لئے وہ ایک چیز

کو بنیاد مقرر کر کے اپنے مزاح کی بنیاد کھڑی کرتے جاتے ہیں ۔ اور فرضی واقعاتی رنگ کی مدد سے وہ گلکاریاں کرتے ہیں کہ باید و شاید ۔ ان اشعار میں ایسی ہی معاملہ بندی نے مزاح کو جنم دیا ہے ۔

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنی مدت میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے "ذرا میرے پاؤں داب تو دے"

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشہ نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشہ ہوا گلا نہ ہوا

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

غالب کے اشعار کی پہلو دار ہونے کی کیفیت بھی مزاح کا سامان بہم پہنچاتی ہے مثلاً

ترے وعدے پر جئے ہم تو اسے جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

غالب کا مزاح عموعاً لطیف شگفتگی تک محدود رہتا ہے ۔ لیکن کئی بار وہ پاسبان عقل کو غچہ دے کر خرمستیوں پر بھی اتر آتے ہیں ۔ اور پھکڑ پن کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔ اس وقت ان کا کلام پست ہو جاتا ہے ۔ گو شوق ظرافت میں انہیں اس کی ذرا بھی پروا نہیں ہوتی ۔ تمام وضع داری اور خود داری کو بالائے طاق رکھتے ہوئے محبوب سے پیش دستی کر بیٹھتے ہیں ۔ اور دھول دھپا ہو جاتا ہے ۔ کبھی کھلم کھلا حرف مطلب زبان پر لاتے ہیں ۔ اور انکار کی صورت میں اصرار کرتے

اور الحاح و زاری پر اتر آتے ہیں ۔ اس وقت ثقاہت منہ چھپا لیتی ہے اور تہذیب سینہ پیٹتی رہ جاتی ہے ۔ دو چار اشعار اس پھکڑ پن کی مثال کے بھی سن لیجئے ۔

دکھا کے جنبش لب ہی تمام کر ہم کو
ندے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

بوسہ دیتے نہیں، اور دل پر ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ "مفت آئے تو مال اچھا ہے"

بوسہ نہیں ، ندیجیئے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عزر مستی ایک دن

غالب فطرت انسانی کے نباض اور ماہر نفسیات ہیں ۔ وہ ذہن انسانی کے عمیق ترین گوشوں تک پہنچ کر شخصی میلانات کا سراغ لگا لیتے ہیں ۔ اور پھر ان کا بیان ایسے شگفتہ انداز میں کرتے ہیں ۔ کہ سننے والا خواہ مخواہ مسکرا اٹھتا ہے ۔ یہ نفسیاتی مزاح بھی بڑا دل خوش کن ہوتا ہے ملاخطہ ہو اپنے آپ پر چوٹ

ہوا ہے شاہ کا مصاحب پھرے ہے اتر اتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

اسی طرح

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ "یاد نہیں"

ہم بڑے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ غالب کا مزاح سدا بہار ہے اور جب تک انسان مسکراتا رہے گا ۔ یہ مزاح بھی زندہ رہے گا ۔

ریحانہ خاتون شمع
ڈھاکہ یونیورسٹی

غالب بحیثیت غزل گو

مرزا غالب کا شمار اردو کے مشہور کلاسیکی شاعروں میں ہوتا ہے۔ اردو ادب میں ان کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ وہ بیک وقت شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی، مکتوب نگار اور ظرافت نگار بھی۔ وہ ایک ایسا ہفت پہلو نگینہ تھے جس کا ہر پہلو پر کشش اور شاندار ہے اور جو کسی نہ کسی طرح ہر نسل کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوتا رہے گا۔ بقول حالی ''لٹریری'' قابلیت کے لحاظ سے مرزا جیسا جامع صفات آدمی امیرخسرو اور فیضی کے بعد آج تک ہندوستان کی خاک سے نہیں اٹھا۔''

بہر حال میری نظر میں غالب بحیثیت غزل گو نہایت بلند مقام رکھتے ہیں ان کی شاعرانہ عظمت کسی تعارف کی محتاج نہیں ان کا پایہ سخن ہر قسم کی توصیف سے بالاتر ہے۔ ان کی جدت طراز طبیعت نے اردو غزل گوئی میں جو امتیازی نشان پیدا کی ہے اس کے پیش نظر اگر انہیں مجدد الوقت کہا جائے تو بیجا نہ ہو گا۔

ہم اس وقت جب تنقیدی مضامین لکھتے ہیں تو غالب کے دور کو عبوری دور کہتے ہیں لیکن غالب کے عہد میں جو لوگ تھے۔ جو فنکار اور جو اہل قلم و اہل سخن تھے ان کو شاید اس کا اندازہ نہ تھا کہ ایک دور ختم ہوتا ہے اور دوسرا دور شروع ہوتا ہے تو پہلے دور کی کچھ قدریں مٹتی ہیں اور نئے دور کی قدریں رونما ہوتی ہیں اگر ایسا ہوتا تو اس زمانے کے فنکار اور صاحبان نظر غالب کے انداز کلام اور رنگ سخن پر انگلیاں نہ اٹھاتے اور کوچہ و بازار میں یہ نہ کہتے

پھرتے کہ

کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اس دور میں انقلاب کے آہنی پنجوں کی گرفت میں کمزور اور ناتواں روایت کو دم توڑتے اور پھڑکتے ہوئے دیکھنے والی باریک بیں نگاہیں غالب کی تھیں اور نئے زمانے کی توانا اور حوصلہ مند قدروں کو سمجھنے والا غالب ہی کا دور اندیش دل و دماغ تھا اور اسی چیز نے غالب سے مخالفتوں اور انگشت نمائیوں کے ہنگاموں ہیں یہ بانگ دہل یہ کہلوایا

ہوں گرمئی نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

چنانچہ جب لکھنؤ میں ناسخ کا طوطی بول رہا تھا اور شعر و شاعری بے جان صنعتوں رعایت لفظی ایہام اور ضلع جگت پر جان دیتی تھی ۔ الفاظ کے الٹ پھیر محاوروں کی نشست و برخاست پر فدا ہو رہی تھی اور

دے دوپٹہ تو اپنا ململ کا
ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

کفن میں بھی پس مردن ہیں دونوں ہاتھ سینہ پر
لحد سے اب کہاں لے جاؤں میں بیتابئ دل کو

آبر پر میری لگایا نیم کا اس نے درخت
بعد مرنے کے میری توقیر آدھی رہ گئی
ٹٹولے قضا لاکھ بستر ہمارا
نہ ہاتھ آئیگا جسم لاغر ہمارا

چلا یوں بن سنور کر جانب مقتل میرا قاتل
کمر میں تیغ ، مٹھی میں کماں اور تیر چٹکی میں

وغیرہ پر جھومتی اور پھڑکتی تھی اور جب خود دہلی میں غالب کے سر پر بیٹھ کر سلطان الہند بہادر شاہ ظفر کے استاد بنکر ذوق زبان و بیان کے چٹخاروں کو عام

کر رہے تھے اور مشاعروں میں ان جیسے اشعار پر

آنکھیں مری تلوؤں سے وہ مل جائے تو اچھا
یہ حسرت پا بوس نکل جائے تو اچھا
تاثیر محبت بھی عجب حب کا عمل ہے
لیکن یہ عمل یار پہ چل جائے تو اچھا

لوگوں کو دیوانہ بنا رہے تھے - اس وقت غالب نے غیر ارادی یا ارادی طور پر پٹے پٹائے راستوں سے الگ ہو کر اپنے لئے ایک ایسی راہ نکالی جو اجنبی ہونے کے ساتھ ساتھ دشوار گزار بھی تھی

ہم پر جفا سے، ترک وفا کا گماں نہیں
ایک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں
کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

حسن اور اس پر حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، اور کو آزمائے کیوں

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تیری شہرت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تیری عادت ہی سہی

مہرباں ہوکے بلا لو مجھے، چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

غالب کو فارسی سے ازلی مناسبت تھی تمام عمر اس زبان سے غیر معمولی دلچسپی لیتے رہے چنانچہ ہندوستان کے فارسی شعراء میں ان کا پایہ بہت بلند ہے - وہ اردو میں شعر کہنا اپنے میلان طبع کے خلاف اور زمانے کے مذاق کے مطابق باعث فخر نہ سمجھتے تھے چنانچہ ایک قطعہ میں خود فرماتے ہیں

فارسی بیں تابہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است
راست می گویم من واز راست نتواں سر کشید
ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ من ست

چنانچہ غالب نے جب شاعری شروع کی تو بیدل کا رنگ سخن اختیار کیا وہی فارسی ترکیبیں ، فارسی انداز بیان ، نازک خیالی بلکہ خیال بندی ، مصنوعی اور بعض جگہ بے کیف دماغی ورزش یہ سب ان کے پہلے دور کی شاعری میں ملتا ہے ۔ جب کے مشکل پسندی کو وہ طرہ امتیاز سمجھتے تھے ۔ ملاحظہ فرمائیے

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
ہوائے سیر گل آئینہ بے مہری قاتل
کہ انداز بخوں غلتیدن بسمل پسند آیا

لیکن ان کی جدت طراز طبیعت نے جلد ہی اس روش کو بھی ترک کرنے پر مجبور کر دیا لہٰذا دوسرا دور وہ ہے جب اشعار بہ اعتبار زبان اور بیان اور بہ لحاظ مضامین سہل ہو گئے اور ان میں ندرت مضامین اور رفعت تخیل کے ساتھ رنگین بیانی اور حسن ادا بھی نمایاں ہونے لگا ۔

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا
بے نیازی حد سے گزری ، بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حال دل ، اور آپ فرمائیں گے کیا ؟''

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے ، تری زلف کے سر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائینگے ہم ، تم کو خبر ہونے تک
لگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکہ کھائیں کیا
عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ
مر گئے پر ، دیکھئے دکھلائیں کیا
پوچھتے ہیں وہ کہ ''غالب کون ہے''
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا ؟

تیسرا دور وہ ہے جب غالب عشق کی خستگی اور برشتگی کو اپناتے ہیں اور ''آپ

بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں" کے تحت پیروی میر کو منتہائے شاعری سمجھتے ہیں اور عشق کے فلسفیانہ خیالات بھی سادہ اور پرکار بن جاتے ہیں اور کلام میں سلاست و روانی سادگی گھلاوٹ سوز و گداز اور صداقت شعری خاص طور سے نمایاں ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے

ابن مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے — وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

کوئی دن گر زندگانی اور ہے — اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں — سوز غم ہائے نہانی اور ہے
دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر — کچھ تو پیغام زبانی اور ہے
موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی

ان تینوں ادوار کی شاعری کا معائنہ کرنے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ جدت و ندرت سے کسی دور کا کلام خالی نہیں ہے۔ دراصل غالب کی جدت طراز فطرت نے کبھی یہ گوارہ نہ کیا کہ اوروں کی روندی ہوئی راہ پر گامزن ہوں لہذا انہوں نے پامال راستہ سے ہٹ کر مگر اس سے کسی قدر ملی ہوئی ایک پگڈنڈی نکالی جس پر عمر بھر گامزن رہے اور رفتہ رفتہ زمانے کو بھی اس پر چلا چھوڑا۔ غالب نے کسی نئی صنف سخن کی بنیاد ڈالی نہ کوئی نیا موضوع اردو شاعری کو دیا۔ نہ صورت کے لحاظ سے اس میں کوئی تبدیلی پیدا کی بلکہ انہوں نے جو تصرفات کئے وہ معنوی ہیں۔ شعر و شاعری کی اندرونی دنیا میں انقلاب برپا کیا۔ مگر بظاہر اس کی صورت وہی رہی ان کی مینا وہی ہے مگر شراب دوسری ہے۔ انہوں نے تقریباً سبھی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی مگر سب میں جدت پیدا کی۔

اگرچہ مرزا کی شاعری کا وہ حصہ جو اردو ادب کا سرمایہ ناز ہے، اکثر اساتذہ اردو کی تصانیف کے سامنے بہت مختصر سا ہے۔ مگر دوسروں کے اچھے اور بلند پایہ اشعار سے کچھ کم نہیں ہے۔ ان اشعار میں مرزا کی جدت طرازی، خیالات کی بلند پردازی، شوخی طبع، معنی آفرینی اور مضامین کے اچھوتے پن کا ثبوت جا بجا ملتا ہے۔ انہوں نے فلسفیانہ، حکیمانہ خیالات کا اردو شاعری میں سنگ بنیاد رکھا۔ جس کا نتیجہ اس وقت تو نہیں مگر بعد میں ظاہر ہوا لیکن خیالات میں تنوع اور انداز بیان میں جدت اسی وقت لوگوں کے سامنے آگئی تھی۔ فلسفہ، تصوف، نفسیاتی حقائق، ظرافت، انداز بیان اور ندرت تخیل کے امتزاج سے ان کا کلام اردو

ادب میں ایک ایک اضافہ ہے ۔ غالب کی سی ہموار غزلیں مشکل ہی سے کسی اور دیوان میں نظر آتی ہیں ۔ بڑے بڑے مضمون کو نہایت اختصار کے ساتھ ایک شعر میں نظم کر دینا بھی ان ہی کا خاصہ ہے ۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا میری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

———

کیا کیا خضر نے سکندر سے　　　اب کسے رہنما کرے کوئی

غالب تجربات اور واردات قلب کو ہو بہو کچھ اس خوبی سے بیان کر دیتے ہیں کہ ہر شخص ع ''میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے'' کے طلسم میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔

ان کا کلام کئی لحاظ سے دماغ پرور ہے کبھی کبھی ان کے اشعار میں دو ایک باتیں ایسی محذوف ہوتی ہیں جن کو پڑھنے والا اپنی طرف سے پورا نہیں کرتا بلکہ اشعار ہی میں بعض الفاظ ایسے لطیف اشارے کرتے ہیں کہ تھوڑی سی ذہنی کاوش کے بعد پڑھنے والے کا دماغ خود بخود اسی ماحول کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو غالب کے پیش نظر تھا ۔ گویا غالب کے ساتھ ہمارے فکر کو جلا ملتی ہے ۔ ہمارے ذہن کی دنیا وسیع ہوتی ہے ۔ روزمرہ کے حقائق کچھ اور نظر آتے ہیں ۔ ان کی شاعرانہ منطق کا جادو گرد و پیش کو ایک نئے اور نرالے رنگ میں رنگ دیتا ہے ۔

جدت تخیل اور جدت ادا کی چند مثالیں دیکھیے

جدت تخیل

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ
حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز
دعا قبول ہو یا رب کہ عمر خضر دراز
ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہ گزار بادیاں

جدت ادا

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جام جم سے یہ میرا جام سفال اچھا ہے
پوچھ مت وجہ سیہ مستی ارباب چمن
سایہ تاک میں ہوتی ہے ہوا ، موج شراب
بوئے گل ، نالہ دل ، دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
وفور اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در ، در و دیوار

جدت تخیل اور جدت ادا کے علاوہ غالب کی ترکیبوں اور تشبیہوں کی جدت بھی اہم ہے - انہوں نے استعارہ و کنایہ اور تمثیل کو جو انشا پردازی کی جان اور شاعری کا ایمان ہیں ، اپنے فارسی کلام کی طرح اردو میں بھی بہت استعال کیا ہے - حسن کاری ، معنی آفرینی اور اختصار تینوں کی جھلک یہاں ملتی ہے - تشبیہات و استعارات کی خاطر کہیں غالب نے شعر کی روح کا خون نہیں کیا ہے ہمیشہ اس سے خلاق و معنی آفرینی میں مدد لی اور یہی مرزا کی مناسبت طبعی کی دلیل ہے -

چند اشعار نمونہ کے لیے حاضر ہیں -

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقت سفر یاد آیا

صبح آیا جانب مشرق نظر
اک نگار آتشیں رخ سر کھلا

غالب کی مسلسل غزلوں کی طرف نظر کیجیے تو وہاں بھی آپ کو حسن و

معنی کی ایک نئی دنیا نظر آئے گی ۔ مثال کے طور پر چند مطلعے پیش خدمت ہیں ۔ ان غزلوں کے اشعار میں کوئی نہ کوئی معنوی مناسبت پائی جاتی ہے ۔

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا پرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا ، میرے بعد

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

دائم پڑا ہوا تیرے در پہ نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

رہئیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
وغیرہ وغیرہ ۔

مسلسل اشعار کی ایک اور خصوصیت جو ان کے کلام میں عام طور پر نمایاں ہے وہ جوش بیان ہے جس کی وجہ سے صاحب شعرالہند غالب کو حافظ کے ہم پلہ قرار دیتے ہیں ۔

غالب کی نفسیاتی گہرائی اور ظرافت طبعی بھی قابل ذکر ہے ۔ ان کی نفسیاتی گہرائی بھی خاص طور پر مقبول ہے ۔ انہوں نے کسی پر مناظر قدرت کی تصویر کشی نہیں کی ہے مگر عاشق کے دل کی حالت اور معشوق کی اندرونی کیفیت نظم کی ہے ۔ انہوں نے قلب کے اندر گھس کر جذبے کی گہرائیوں کو ٹٹولا ۔ اور جذبات انسانی کی پردہ کشائی کی ہے ۔ وہ خارجی حالات کے مصور غم نہیں بلکہ داخلی کیفیات کے مصور ہیں جس کی انہوں نے زندہ جاوید مثالیں پیش کی ہیں ۔

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجئیے ہم نے مدعا پایا

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا ، غم روزگار ہوتا

اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

گو میں رہا ، رہین ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا تیرے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا میرے آگے

ایک اور نمایاں خصوصیت مرزا کی طرز ادا ہے ۔ ان کے اکثر اشعار کا انداز بیان ایسا پہلو دار ہے کہ بادی النظر میں اس سے کچھ اور مفہوم مراد ہوتے ہیں ، مگر غور کرنے کے بعد دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں ۔ مثلاً

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　　دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا

غالب کی تیز نگاہ زندگی کے حقیقی اور عملی پہلو پر پڑتی ہے ۔ وہ تصوف کے اکثر رموز و مسائل نہایت لطیف پیرائے میں اور نہایت صفائی کے ساتھ بیان کرتے ہیں ۔ ذرا غور فرمائیے ۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

شوخی و ظرافت کی طرف نگاہ اٹھائیے تو وہاں بھی مرزا کا ایک نرالا رنگ نظر آتا ہے ان کی نفسیاتی گہرائی کی وجہ سے ان میں وہ لطافت یا شگفتگی پائی جاتی ہے جو ظرافت کی اساس و بنیاد ہے - ہر انسان کی زندگی میں غم اور خوشی دونوں ہیں - غالب بھی اس سے مبرا نہیں تھے - مگر وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو مصائب سے گھبرا کر بلبلا اٹھتے ہیں ان میں خود پر قابو پانے اور نا سازگار حالات کا حوصلہ مندی و جواں مردی سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت تھی - وہ رنگ نشاط اور بار الم اٹھانے کے بعد میر کی طرح آنسوؤں اور آہوں کا مرقع نہیں بنے - نہ اصغر کی طرح بے حسی کا شکار ہوئے بلکہ انہوں نے یہ سیکھا ہے کہ سختی و مستی - رنج و الم سب، کو ہموار کریں - جوں جوں ذہنی پختگی ہوتی گئی اور زندگی کے نشیب و فراز سے آگہی ہوتی گئی ، جن واقعات پر وہ آنسو بہاتے تھے اب مسکرا دیتے اور ہنسی میں آڑا دیتے - ظرافت و شگفتگی کے نرم چھینٹوں سے آنسوؤں کو دھو لیتے - ان کی شوخی کی اصلی بنا ان کی جدت طرازی اور بات میں بات پیدا کرنے کی عادت تھی - کبھی خود پر بھی ہنسنے سے باز نہیں آتے تھے -

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

ظرافت اور شعرا کے یہاں بھی ہے - سودا ، انشاء ، نظیر کم و بیش سبھی ہنستے ہیں نظیر تو بڑے زندہ دل انسان ہیں - انشاء کی طباعی اور سوداؔ کی ذہانت کا

کون قائل نہیں ہے مگر غالب کے مقابلہ میں ان سب کی ظرافت کچھ پھیکی پڑ جاتی ہے ۔ ان کی شوخی ، خوش طبعی ، لطافت اور ہلکی پھلکی ظرافت کی چند اور مثالیں دیکھیئے ۔

چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہئے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

قرض کی پیتے تھے مے اور دل میں کہتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

غالب دوسروں کی تقلید سے ہمیشہ بچتے رہے ۔ وہ خود سوچنے اور کہنے کی جرأت رکھتے ہیں وہ روایت کے غلام نہیں بلکہ ان میں حیرت انگیز جدت پسندی ' آزادیٔ رائے ۔ خود اعتادی اور زندگی گزارنے کا حوصلہ ملتا ہے ۔ ان کی شاعری میں ہمیں پہلی بار ایک ایسا دلیر اور منہ پھٹ انسان ملتا ہے جو بہشت کے رسمی تصور پر ہنس سکتا ہے ۔ اور وہاں بھی ''روزن دیوار'' کی کمی محسوس کر سکتا ہے ۔ جو فرشتوں پر بھی طنز کرنے سے نہیں چوکتا ۔ جو عشق کی مریض روحانیت کا قائل نہیں اور نہ اسے محض حیوانیت بنائے رکھنا پسند کرتا ہے ۔ بلکہ جس کے یہاں ایک تندرست ذہن اور تندرست جسم دونوں ہی موجود ہیں ۔

اخلاق کی مضامین دیکھئے کس خوبی سے ادا کئے ہیں ۔

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

سفینہ جب کہ کنارے پر آ لگا غالب
خدا سے کیا ، ستم و جور نا خدا کیجئے

درد و غم کی داستاں نہایت موثر انداز اور مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہیں ۔ کلام میں جہاں کہیں درد ہے اس میں حسرت کا پہلو بھی شامل نظر آتا ہے ۔ جس سے تاثیر کے ساتھ ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے ۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

دل نادان تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

اسکے علاوہ مرزا کی شاعری میں وہ تمام عناصر اور خصوصیات پائی جاتی ہیں جو غزل گوئی کے دائرہ میں شامل سمجھی جاتی ہیں ۔ مثلاً :-

فلسفہ عشق و محبت 'سوز و گداز' یاس یعنی قنوطیت ، رندانہ مضامین ۔ محاکات یا واقعہ نگاری ۔ معاملہ بندی زہد و تقویٰ کی تضحیک ۔ غیرت و خودداری وغیرہ وغیرہ —— طوالت مانع ہے اس لیے مجبوراً ہر عنوان کے تحت چند مثالوں ہی پر اکتفا کرتی ہیں ۔ ملاحظہ فرمائیے ۔

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

قنوطیت :— منحصر مرنے پہ ہو جسکی اُمید
نا امیدی اُس کی دیکھا چاہیے
رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس اُمید پر کہیئے کہ آرزو کیا ہے

———

خمریات:— وہ چیز جس کے لیے ہم کو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام و مشک بو کیا ہے

———

پھر دیکھیئے انداز گل افشانی گفتار
رکھ دیجئے پیمانہ و صہبا مرے آگے
کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

———

محاکات:— دیکھے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر کچھ تو پیغام زبانی اور ہے
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

———

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

———

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے ''یہ کیا ہے''؟ تو چھپائے نہ بنے

———

تغزل :— غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

———

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو ، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو''

———

کبھی کی بھر گئیں آنکھیں ، فرشتے بھی نظر آئے
تمہارا منہ چھپانا دیکھئے کیا کیا دکھاتا ہے

غیرت و خود داری !۔

درد منت کش دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

وہ اپنی خو نہ چھوڑینگے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

وفا کیسی ، کہاں کا عشق ، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہے

خلاصہ کلام یہ ہے کہ صنف غزل میں غالب کی شہسواری لائق تحسین ہے بقول آل احمد سرور جب تک شاعری میں انوکھے جذبات ، نت نئے خیالات ، حسین اور جاندار اور زندگی کے تہر تھراتے ہوئے الفاظ کی قدر ہے غالب کی قدر باقی رہیگی یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنی فلسفیانہ کاوشوں اور لہجہ کی بلندیوں سے اردو ادب کو دفعتاً بلند کر دیا اور زبان کی سطح ہمیشہ سے زیادہ اونچی ہو گئی ۔ معنی آفرینی ، ندرت تخیل ، محاکات ، سوز و گداز اور تاثیر کلام کے لحاظ سے غالب غیر معمولی حیثیت رکھتے ہیں ۔ تغزل ، رندانہ مضامین ، تصوف اور شوخی و شگفتگی مرزا غالب کا سرمایہ کلام ہیں ۔

عبدالباری عباسی
ایم ۔ اے

خطوط غالب میں ڈرامائی عناصر

اردو ادب اپنی کم عمری کے باوجود شاعری ، فکشن اور مضامین وغیرہ میں کم سواد اور بے بضاعت نہیں ۔ لیکن ڈرامے کے باب میں جب بھی غور کیا ہے داغ کا سرمایہ دود ہی نظر آیا ۔ ہمارے ادب میں ابھی تک کوئی کالیداس ، شیکسپیئر یا برنارڈ شا پیدا نہیں ہوا اگرچہ کچھ لوگوں نے اس صنف ادب کو پیش کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے بھی ہیں تو دوسروں کی خوشہ چینی کی حد تک۔طبعزاد ڈرامے ہمارے ہاں ہنوز بہت ہی کم ہیں ۔

اس کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو یہ حقیقت ہے کہ اردو ادب کے خصوصاً کلاسیکل دور میں باقاعدہ ڈرامے کی پرچھائیں تک نظر نہیں آتی تاہم اس کے اجزائے ترکیبی اکثر ادب پاروں میں بکھرے ہوئے نظر آ جاتے ہیں ۔ میری نظر میں غالب کے خطوط بھی ویسے ہی ادب پاروں کے ذیل میں آتے ہیں جن میں ڈرامائی عناصر ، چاہے غیر شعوری طور پر ہی سہی ، اکثر جگہوں پر سمو دیئے گئے ہیں ۔ اس مختصر مضمون میں ایسے ہی جواہر پاروں کا ہلکا سا تجزیہ کرنا مقصود ہے ۔

کہانی ، افسانہ اور ناول کی طرح ڈراما کی بھی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے ۔ ڈرامہ میں جب تک کوئی قصہ نہ ہو بات نہیں بنتی ۔ خطوط غالب میں بظاہر قصہ بیان نہیں ہوا ۔ واقعات کا الجھاؤ اور پھر سلجھاؤ بھی نظر نہیں آتا ۔ جس میں نقطہ عروج کی نشان دہی کی جا سکے ۔ لیکن بنظر غور دیکھا جائے تو ان خطوط میں ملک و قوم کی پچاس ساٹھ سالہ تاریخ موجود ہے ۔ جس کے واقعات میں اٹھان بھی ہے ، ہیجان بھی ، رنگین صحبتیں بھی ہیں ، مجالس و عزا بھی ، محفل آرائیاں بھی

ہیں ، دوستوں سے ملنے کی خوشی بھی ، محفلوں کے اُجڑنے اور عزیز و اقارب کے بے موت مارے جانے کا قلق بھی - یہ کہانی چند افراد کے اعمال پر مبنی نہیں بلکہ ایک پورے معاشرے کی داستان ہے - ایک تہذیبی محل کے گرنے اور دوسری تہذیب کے چھا جانے کا قصہ ہے - اس میں اقتدار ہاتھوں سے جانے کا سماں ہے - جس کی فضا میں خون بکھرا ہوا ہے - کٹے ہوئے سر ، سولیوں پر لٹکی ہوئی لاشیں ، آسمان کو چیرتی ہوئی فضائیں ، دلوں سے اٹھتا ہوا دھواں ہر چیز نظر آتی ہے - حیرانی پریشانی ، بھوک ، پیاس ، بیماری اور موت ناچتی چنگھاڑتی محسوس ہوتی ہے - دلی شہر پر کئی کئی طرح کے حملے ہوتے نظر آتے ہیں - ملاحظہ فرمائیے ''پانچ لشکر کا حملہ پے در پے اس شہر پر ہوا - پہلا باغیوں کا لشکر اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا - دوسرا لشکر خاکیوں کا اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکیں و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے - تیسرا لشکر کال کا - اس میں ہزار ہا آدمی بھوکے مرے - چوتھا لشکر ہیضے کا - اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے - پانچواں لشکر تپ کا اس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی - پلاٹ یعنی کہانی کی ترتیب کو استوار کرنا - ڈرامہ نگاری شرائط اولین میں سے ہے - غالب کے خطوط میں کوئی ایک کہانی ہی نہیں تو پلاٹ کہاں سے آئے - لیکن کہیں کہیں ایسا محسوس ضرور ہوتا ہے کہ سٹیج پر ماضی کا کوئی سین دکھایا جا رہا ہے کہ اچانک پردہ گرتا ہے اور پھر چند منٹ بعد جب اٹھتا ہے تو ایک بالکل مختلف سین آنکھوں کے سامنے آنے لگتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعات کے بیان میں ایک خاص ترتیب بھی موجود ہے - مثلاً وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت در پیش آئے - شعر کہے ، دیوان جمع کیے -

(پردہ)

ناگاہ - نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط نہ وہ انبساط - بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا - اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے یعنی جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی ہے اور اس محلہ کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے - لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا -''

اگر پچاس ساٹھ سالہ دور اس داستانِ انقلاب کو ڈرامہ کی کہانی فرض کر لیا جائے تو اس میں مرکزی کردار صرف ایک نظر آتا ہے جو خود غالب ہے اس کردار میں ڈرامہ کے آٹھوں رس موجود ہیں - جن کو رومان ، فرحت ، غم و غصہ ، خوف ،

حوصلہ ، نفرت اور حیرت کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے ۔ یہ تمام کیفیات اس کردار پر مختلف اوقات میں طاری ہوتے ہیں اور یہ اپنے مکالمات کے ذریعے ان تمام تاثرات کا اظہار اس چابک دستی سے کرتا ہے کہ اسے کریکٹر ایکٹر ماننا پڑتا ہے ۔

اس کردار کے مقابلے میں کئی اور کردار بھی آتے ہیں ۔ لیکن وہ سب کے سب ضمنی ہیں ۔ جو تھوڑی تھوڑی دیر کو اس کی شخصیت ابھارنے آتے اور چلے جاتے ہیں یہ مرکزی کردار کبھی اپنے بالا خانے سے کسی دوست کا استقبال کرتا ہے ''آؤ مرزا تفتہ میرے گلے لگ جاؤ ۔ بیٹھو اور میری حقیقت سنو ۔''

کبھی کسی کے اچانک آ جانے پر اٹھ کر ہاتھ ملاتا ہے ۔ ''آئیے جناب میر مہدی صاحب دہلوی ۔ بہت دنوں میں آئے کہاں تھے ؟ بارے آپ کا مزاج تو خوش ہے ۔''

کبھی کسی پر شفقت آمیز غصہ کرتا ہے ''خدا تجھ کو ایک سو بیس برس کی عمر دے بوڑھا ہونے آیا ۔ داڑھی میں بال سفید آ گئے مگر بات سمجھنی نہ آئی'' کبھی کسی خوبرو کو ڈانٹتا ہے ۔ ''آخر لڑکے ہو بات کو نہ سمجھے!'' پھر پیار سے سمجھاتا ہے ''میری جان کیا سمجھے ہو سب مخلوقات تفتہ و غالب کیوں کر بن جائیں !''

کبھی خود چل کر کسی کی ملاقات کو جاتا ہے اور اس لہجہ میں بات کرتا ہے ''صاحب کیوں مجھے یاد کیا ہے ، کیوں خط لکھنے کی تکلیف اٹھائی ؟ یہ کردار کبھی نواب معلوم ہوتا ہے ، کہیں فقیر ، کہیں غنی ، کہیں محتاج کبھی اگر دروازہ وا نہ ہو تو کعبہ سے بھی الٹا پھر آتا ہے ۔کبھی معمولی سے معمولی انگریز کے بوٹ کی ٹو چاٹتا ہے ۔ کہیں نیازمند ہے اور کہیں سراپا ناز ۔

یہی کچھ نہیں ان ادب پاروں میں عجیب طرح کی نیرنگی بھی پائی جاتی ہے اردوئے معلیٰ کو جس جگہ سے کھولیے ایک نیا سین سامنے ہوگا ۔ ایک سین میں دن کے بارہ بجے کا وقت پیش کیا گیا ہے ۔ ایک بوڑھا آدمی ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا حقہ پی رہا ہے ۔ ایک آدمی خط لا کر دیتا ہے ، خط پڑھتے ہوئے اس شخص پر جنونی کیفیت طاری ہوتی ہے ۔ بار بار گریباں کی طرح ہاتھ لاتا ہے کہ اگر کوئی انگرکھا یا کرتا گلے میں ہوتا تو گریباں پھاڑ ڈالتا ۔

دوسرے سین میں وہی بوڑھا دل شکستہ بیٹھا ہے اور کہہ رہا ہے ۔۔۔۔ میں

ایسے عذاب میں بیٹھا ہوں جیسے مجرم بندی خانے میں ہو اور وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو کافر جہنم میں دیکھے ۔ نواب صاحب نے مجھے دم دلاسے دے کر ٹال دیا اور بیدردی کی ایسی ادا سے جو التفات سے کچھ ملتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آخر کب تک صبر کروں ۔ کب تک کچھ ہونے پر مطمئن بیٹھا رہوں ؟ ۔ تیسرے سین میں وہی بوڑھا اپنوں اور پرایوں کا غمگسار۔عزادار نظر آتا ہے اس کے چہرے پر لکھا ہے ۔

ہم سے پوچھے کوئی مفہوم قیامت کیا ہے
ہم نے دیکھا ہے بھرے گھر کا بیاباں ہونا

ایک سین میں وہی بوڑھا کسی کو خط لکھتے ہوئے کہہ رہا ہے ۔ ”۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہے ہے کیوں کر لکھوں حکیم رضی الدین خاں کو قتل عام میں ایک خاکی نے گولی مار دی ۔ احمد حسین خاں اسی دن مارے گئے طالع یار خاں کے دونوں لڑکے ٹونک سے آئے تھے بے گناہوں کو پھانسی ملی۔“

پھر ایک گہری آہ کھینچتا ہے ۔ دل سے دھواں اٹھتا ہے جو الفاظ کے دائرے سے بنا دیتا ہے کہ ”نظام الدین مجنون کہاں! مومن کہاں! ذوق کہاں! ایک آزردہ سو خاموش دوسرا غالب وہ بیخود و مدہوش ۔ نہ سخنوری رہی نہ سخن دانی ۔ کس برتے پر تتا پانی ۔“

ایک سین کا منظرنامہ یہ ہے کہ ایک نواب نما شخص ایک کوٹھری میں بیٹھا ہے ۔ خس کی ٹٹی لگی ہے ۔ ہوا آ رہی ہے ۔ پانی کا جھجر دھرا ہوا ہے وہ شخص حقہ پی رہا ہے ۔ خط لکھتے ہوئے با رعب لہجہ میں پکارتا ہے ”ارے کوئی ہے ذرا یوسف مرزا کو بلائیو ۔“

اگلے سین میں ایک وضع دار سا رئیس اپنے بالا خانہ پر بیٹھا نظر آتا ہے سامنے سے کوئی دوست گزرتا ہے تو اس سے یوں محو کلام ہو جاتا ہے ۔

رئیس ۔ ”اے جناب میرن صاحب! السلام علیکم

میرن۔ حضرت آداب !

رئیس ۔ کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی ۔

میرن ۔ حور ! میں کیا منضع کرتا ہوں ۔ میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں ۔ بخار جاتا رہا ۔ صرف پیچش باقی ہے وہ بھی رفع

ہوجائیگی - اپنے ہر خط میں آپکی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں آپ پھر کیوں تکلیف کریں -

رئیس - ہیں میرن صاحب ! اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں - وہ خفا ہوا ہوگا - جواب لکھنا ضرور ہے -

میرن - وہ آپ کے فرزند ہیں - آپ سے خفا کیوں ہوں گے -

رئیس - (غالب) بھائی آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو ؟

میرن - سبحان اللہ ! اے لو حضرت - آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے -

رئیس - اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں ؟

میرن - کیا عرض کروں سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور پڑھا جاتا ہے تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا ہوں اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ تمہارا خط جاوے -

رئیس - میاں بیٹھو - ہوش کی خبر لو - تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ ؟ میں بوڑھا آدمی - بھولا آدمی تمہاری باتوں میں آ گیا اور آج تک اسے خط نہیں لکھا۔لاحول ولاقوۃ''

سلولوکی (خود کلامی) یعنی ضمیر کی آواز - اسٹیج ڈرامے کی دنیا میں شیکسپیئر سے لے کر آج تک تاثر پیدا کرنے کا ایک اہم ذریعہ بنی رہی ہے یہاں تک کہ اب فلموں میں باقاعدہ انسان کے اپنے عکس کو آئینہ میں دکھا کر اس کو زبان اور آواز دی جاتی ہے جس سے سین کا تاثر چہار چند ہو جاتا ہے - غالب کے خطوط میں یہ خوبی بھی پائی جاتی ہے جس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن میں سے ایک منظر یہ ہے -

بادشاہ سلامت کا ایک بلند مرتبہ مصاحب بہت خوش خوش اتراتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوتا ہے - شاید آج کوئی کامیاب قصیدہ پڑھنے پر نجم الدولہ دبیرالملک کا خطاب ملا ہے یا شاید ظل سبحانی نے تنخواہ ماہ بماہ کرتے ہوئے خلعت فاخرہ عنایت کر دیا ہے - اب وہ انتہائی مسرور اور خوش خوش آئینہ کے سامنے آ کر کھڑا ہی ہوا ہے کہ اس کا گویا عکس بول اٹھتا ہے ''سن غالب''۔

ہم تجھ سے کہتے ہیں بہت مصاحب نہ بن - اے ایاز قدر خود بہ شناس اور اس مصاحب کے ساتھ ساتھ دوسرے سامعین بھی چونک پڑتے ہیں -

ایک سین میں یہی مصاحب جو خود کو اہتمام کے ساتھ نواب اسد اللہ خاں کہلواتا اور لکھواتا ہے اپنے کسی بزرگ کے سامنے نیاز مندانہ حاضری دیتا نظر آتا ہے -

غالب - پیر و مرشد ! کورنش - مزاج اقدس ؟

پیر و مرشد (شفق) الحمد للہ - تو اچھا ہے ؟

غالب - حضرت دعا کرتا ہوں -

ایک اور منظر ملاحظہ فرمائیے جو اپنی جگہ تاریخی دستاویز کی حیثیت بھی رکھتا ہے -

دلی شہر میں ''لاہوری دروازے کا تھانیدار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھا ہے -

جو (آدمی) باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات بھیج دیتا ہے - حاکم کے یہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے - آٹھ دن قید رہتا ہے -''

غالب کے خطوط میں بکھرے ہوئے اس ڈرامہ میں عمدہ سیٹنگ ، بہترین ایکٹنگ اور منظر نامہ ہر چیز موجود ہے - یہ ڈرامہ جس میں واقعات کا تانا بانا بظاہر ایک ہی کردار کے گرد بنایا گیا ہے لیکن جو کہیں کہیں پھیل کر دلی کا پورا معاشرہ سمیٹ لیتا ہے اسی ذہنی کشمکش ، متضاد خیالات کا ٹکراؤ ، ہم آہنگ اور ہم خیال دوستوں کا ملاپ ، کامیڈی ، رومان ، جنگ جھڑپ اور مکالمات کا وہ جوش و خروش جسے آج کی اصطلاح میں ''ڈرامہ'' کہا جاتا ہے سب کچھ موجود ہے -

اس میں سارے زمانے کے واقعات موجود ہیں اور لطف یہ ہے کہ قصہ کوئی بھی نہیں بس ایک کردار ہے جو اپنی ذات میں انجمن ہے جس کا دل جہان آرزو ہے اور جو ڈرامے کے اختتام پر حالات کی ناسازگاری ابنائے وطن کی بے مہری اور کافر محبوب کی بے وفائی اور دل شکن اداؤں پر کہتا ہوا نظر آتا ہے -

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تونے آئینہ تصویر درد تھا

یہ شعر پڑھتے ہوئے وہ دل پکڑ کر گر جاتا ہے - حالت خراب ہونے لگتی ہے اور

جب اسی وقت کوئی آدمی مزاج پرسی کو آ جاتا ہے تو آپ جواب دیتا ہے ۔ ''میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو ۔ دو چار دن بعد محلہ والوں سے پوچھ لینا'' ۔ آدمی چلا جاتا ہے ۔

اسی لمحہ ڈراپ سین گرنے لگتا ہے اور پس منظر سے میر مہدی مجروح کی غم میں ڈوبی ہوئی آواز ابھرتی ہے ۔

رشک عرفی فخر طالب مرد
اسد اللہ خاں غالب مرد

''جہاں تک میری نظر کام کرتی ہے ۔ ہم ہندوستانی مسلمانوں میں سے اگر کسی نے مسلمانی ادبیات مستقل اضافہ کیا ہے تو وہ فارسی کے مشہور شاعر مرزا غالب ہیں ۔ وہ دراصل ان شاعروں میں سے ہیں جن کے ادراک اور تخیل کی بلندی انہیں عقیدے اور ملت کی حدود بالاتر مقام عطا کرتی ہے ۔ ان کی قدر شناسی کا دور آنے والا ہے'' ۔

(علامہ اقبال ۱۹۱۰ء)

افتخار احمد انصاری

غالب

رجائی تھے یا قنوطی

مرزا غالب کی زندگی غم و یاس کی آماجگاہ تھی۔ بچپن سے لیکر موت تک رنج و الم کے مہیب سائے ان کی زندگی پر چھائے رہے۔ بچپن میں یتیم ہو کر دوسرے لوگوں کے گھر پرورش پانا شعوری طور پر انسان میں احساس کمتری پیدا کر دیتا ہے۔ پھر مالی مشکلات سوہان روح ثابت ہوئیں۔ شہزادہ سلیم کی مدح سرائی کی اور یہ امید اس سے وابستہ کی وہ ولی عہد بن جائے گا۔ لیکن انگریزوں نے اس کو ولی عہد تسلیم نہ کیا۔ مقدمہ پنشن کی دل آزاریاں ایسے صدمات تھے جنہوں نے مرزا کے خرمن حیات کو جلا کر رکھ دیا اور وہ کبھی بغیر نہ رہ سکے۔

ہے موجزن اک قلزم خون کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا میرے آگے

۱۸۵۷ء کے غدر نے دہلی کی ادبی محفلوں کو درہم برہم کر دیا۔ مرزا کے احباب کچھ جلا وطن کر دئیے گئے۔ اور باقی اس ہنگامے کی تاب نہ لا کر دوسرے شہروں میں جا بسے۔ بعض کے گھروں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ مرزا نے یہ بربادی اپنی آنکھوں سے دیکھی تو ان کا دل پکار اٹھا۔

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تیغ ستم نکلے

مرزا کے خانگی حالات بھی دگر گوں اور ناخوشگوار تھے ان کی اولاد مر جاتی تھی انہوں نے زین العابدین عارف کو جو ان کی بیوی کے بھانجے تھے متبنیٰ بنا لیا

لیکن عین شباب پر پہنچ کر وہ داغ مفارقت دے گئے - مرزا نے ان کے غم میں ایک درد انگیز مرثیہ لکھا تھا -

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

یہ غالب کی زندگی کا ماحول تھا - زمانے کے ترکش میں کوئی تیر باقی نہ تھا جو اس نے غالب کی طرف نہیں چھوڑا - اس لئے چاہیے تھا کہ ان کا کلام رنج و غم اور الم کا ایک حسین عنصر ہوتا لیکن ان تمام صدمات کے باوجود بھی غالب کا کلام ظرافت اور شوخی سے بھرپور اور زیر لب تبسم کی ہلکی پھلکی بریں ان کے کلام میں جا بجا نظر آتی ہیں - ان کی ظرافت اور شوخی نے ان کے کلام میں مٹھاس اور چاشنی پیدا کر دی ہے کہ قاری کی طبیعت پڑھنے سے شگفتہ ہو جاتی ہے -

خیال کیا جاتا ہے کہ چونکہ غالب کی زندگی درد غم سے مملو تھی اس لئے وہ یا سیت نواز اور قنوطی ہیں لیکن ایسا کہنا اس پرعظمت انسان کی توہین ہوگی غالب کو نا مرادیوں اور ناکامیوں سے دست و گریباں ہونا آتا ہے - وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ دکھوں اور تکلیفوں کے باوجود بھی مزاح پیدا کرنے کے کون کون سے طریقے ہیں - غالب کا سینہ حسرتوں اور ارمانوں سے لبریز ہے - ان کا دل حالات زمانہ سے مجروح ہے لیکن پھر بھی وہ اپنی خواہشات کے لئے کہتے ہیں -

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

قنوطی انسان زندگی کے بوجھ سے تھک جاتا ہے وہ ہر خواہش کو سراب سمجھتا ہے اور اسے شرمندہ تعبیر ہوتا ہوا نہیں دیکھتا لیکن غالب پر امید ہیں - اگرچہ کوئی امید بھی پوری ہوتی نظر نہیں آتی ،مگر پھر بھی وہ امید کے سہارے ایسے وقت کی آمد کے منتظر ہیں جب یہ امید برآئے چنانچہ کہتے ہیں -

غیر سے دیکھیے کیا خوب نبھائی اس نے
نہ سہی ہم سے پر اس بت میں وفا ہے تو سہی

ایک رجائی کی یہ شان ہے کہ اس کا سینہ ہزاروں خواہشوں اور ارمانوں سے پر ہوتا ہے - اور اپنے ارمانوں کو نکالنے سے اسے حقیقی لذت نصیب ہو - اس کا دل نئے نئے داغوں سے ہرا ہو - غالب میں یہ چیز بدرجہ اتم موجود ہے - وہ دلکش

انداز میں فرماتے ہیں ۔

عشرت پارہ دل زخم تمنا کھانا
لذت ریش جگر غرق نمکداں ہونا

ایک یاسیت نواز اور قنوطی کا دل رنج و الم سے ٹوٹ جاتا ہے یاسیت کے گھناؤنے سائے اسے دنیا سے بدظن کر دیتے ہیں ۔ اس کا ذوق جستجو اور ذوق طلب سرد ہو جاتا ہے اس کے بر عکس ایک رجائی زخم تمنا کھانے کے بعد ایک قسم کی لذت اور سرور محسوس کرتا ہے ۔ جہاں اس کے ارمانوں میں طوفان کا ہیجان پایا جاتا ہے ۔ وہاں اس کا ذوق طلب اسے حرارت اور گرمی عطا کرتا ہے ۔ اس کے نزدیک زندگی پیہم ۔ ایک جد و جہد اور رنج و الم کی آما جگہ ہے ۔ وہ اسے ایک مسلسل جستجو اور تلاش سمجھتا ہے ۔ مرزا غالب بھی زندگی کو مسلسل جستجو تصور کرتے تھے ۔ ان کا دل اس کی گواہی دیتا ہے اور خیالات ترجمانی کرتے ہیں ۔

زندگی کیا مسلسل جستجو ہے اور کیا
جو کبھی پوری نہ ہو وہ آرزو ہے اور کیا

انسان کی زندگی کا منتہائے مقصود مسلسل جد و جہد اور پیہم کوشش ہے ۔ اسے منزل ملے نہ ملے اس کا کام منزل تک پہنچنے کے لئے کوشاں رہنا ہے ۔ خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تم نے کتنے انسان دائرہ اسلام میں داخل کئے وہ پوچھے گا کہ تم نے میرے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے کتنی کوشش کی ۔ غالب بھی اسی اصول کے قائل تھے ۔ ان کا مقصد منزل کی تلاش اور جستجو تھی ۔ اس جستجو میں خواہ کتنی ہی ناکامیوں اور مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑے نا امیدی کو اپنے پاس بھی پھٹکنے نہ دیا جائے ۔ غالب کی زندگی گونا گوں تکلیفوں اور مصیبتوں سے مرکب تھی لیکن پھر بھی مایوسی اور نا امیدی ان کے پاس تک نہ پھٹکی ان کی ظرافت اور مزاح نے نا امیدی کو ختم کر دیا ہے ۔ مایوسی غالب کے مذہب میں ایک جرم عظیم ہے ۔ ان کا دامن امید کے گونا گوں پھولوں سے مزین نظر آتا ہے ۔ اس کی زندگی ایک مجاہد کی زندگی ہے ۔ جس میں ہزاروں مصائب کا سامنا وہ مسکراتے ہوئے کرتے ہیں ان کا مزاج زندگی سے کھٹا نہیں ہوتا اور اس سے فرار نہیں ہونا چاہتے اس لئے ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھنے کے عادی بھی نہیں ان کا عزم جوان عزم نظر آتا ہے ۔ بلکہ وہ ایک ایسی زندگی کا خیر مقدم کرتے ہیں ۔ جس کے راستے مصائب و آلام کے کانٹوں سے اٹے پڑے ہیں ۔ پر خار اور پر صعب راستوں پر چل کر وہ ایک لذت اور ایک کیف محسوس کرتے ہیں ۔ جب انہیں ایسی زندگی کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے تو خوش ہوتے ہیں کہ اب جی کے ارمان پورے کرنے کا موقعہ آیا

ان آبلوں سے پاؤں کے گبھرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

ایک قنوطی انسان کب ایسے راستوں پر چل سکتا ہے جو پر خار راہوں اور قدم قدم پر مشکلات کی کرچیاں پاوں میں چبھنے کے لئے تیار ہوں ایسی راہوں کو دیکھ کر وہ عزم و ہمت کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے کیونکہ ان کی طبیعت ایسی مصیبتوں کا مردانہ وار مقابلہ نہیں کر سکتی لیکن غالب تو ایسی مصیبتوں کو جھیلنے کے لئے تیار بیٹھا ہے۔

تھی نو اموز فنا ہمت دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

ہر انسان کی زندگی میں دکھ درد ضرور آتے ہیں۔ اسے زندگی کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑتا ہے لیکن باہمت اور حوصلہ مند لوگ ان غموں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے بلکہ مسکرا مسکرا کر ان تکالیف کو برداشت کرتے ہیں۔ مرزا غالب کی زندگی ایک دکھ بھری داستان ہے لیکن رجائی ہوتے ہوئے انہوں نے ان تمام مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے بلکہ دوسرے دوستوں اور احباب کو مختلف طریقوں سے غم غلط کرنے کے انداز بتائے ہیں چنانچہ مرزا حاتم علی بیگ کو ان کی محبوبہ کے انتقال پر یوں حوصلہ دلاتے ہیں۔

"مرزا صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی ہے ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے ہدایت کی تھی کہ ہم کو زہدورع منظور نہیں ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ کھاؤ پیو۔ مزے اڑاؤ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو۔ شہد کی نہ بنو۔ میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشانی کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا فکر بجا لاو۔ غم نہ کھاؤ۔ غم نہ کھاؤ اور ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو۔ تو چناجان نہ سہی مناجان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اگر مغفرت ہو گئی۔ ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی اور اسی نیک بخت کے ساتھ زندگانی۔ تو اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے اجیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بد دور وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ"۔

مرزا غالب کی زبردست شخصیت محرومیوں اور ناکامیوں کے باوجود بھی زندگی سے ہم کنار رہنے کی آرزو مند ہے - ان کی نظر بہت بلند ہے - ایک عاصی کے نظریات ان کی نظر و فکر کی بلندیوں کو نہیں چھو سکتے - خوشی کے متعلق غالب کا مطمع نظر دوسرے انسانوں سے بلند تر ہے - وہ غم کے بھی قائل ہیں مگر یاس و حرماں نصیبی کو اپنے پاس بھٹکنے کا موقعہ نہیں دیتے - ان کے نزدیک غم ایک ایسا نغمہ ہے جو انسانی زندگی کے ساز پر گایا جاتا ہے - فرماتے ہیں -

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

ایک مسلمان قنوطی نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس کا مذہب اسے یاسیت نہیں سکھاتا ارشاد باری تعالیٰ ہے -

لا تقنطوامن رحمتہ اللہ ، انہہ ارحمہ الرحمین -

(اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو - بیشک وہ تمام رحم کرنیوالوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے)

غالب مسلمان ہیں - ان کا مذہب انہیں قنوطیت سے باز رہنے میں مدد ہے - وہ جانتے ہیں کہ ان کی امیدیں ضرور پوری ہوں گی - اگر اس دنیا میں پوری نہیں ہوئیں تو اگلے جہان میں ضرور بر آئیں گی - لہٰذا کہتے ہیں -

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگرواں ہو گئیں

ان دلائل و براہین سے ثابت ہوتا ہے کہ غالب رجائی ہیں - ان کی ذات پر قنوطی کا لیبل چسپاں کرنا ان کے ساتھ زیادتی ہے - اور جو لوگ انہیں قنوطیت پسند تصور کرتے ہیں وہ دراصل ایک بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں -

غلام احمد بشیر

غالب کی جدت پسندی

مولانا حالی ''یادگار غالب'' میں لکھتے ہیں کہ ''غالب۔عام روش سے ہٹ کر چلنے کے عادی تھے۔

عام روش سے ہٹ کر چلنے کا رجحان نہ صرف غالب کے کلام بلکہ ان کی تمام زندگی پر بھی چھایا ہوا ہے ۔وہ لباس ، رہن سہن ، خورد و نوش اور میل ملاقات ، غرض ہر چیز میں اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہیں ۔ ان سے اس رجحان کے پس منظر میں گئے بغیر ، آئیے دیکھیں کہ اس سے ان کا کلام کس کس طرح متاثر ہوا ۔

غالب کے کلام میں ''جدت ادا'' اور ''جدت خیال'' دونوں موجود ہیں اور یہ جدت ان کے کلام میں کئی رنگ اور پہلو اختیار کرتی ہے ۔ مثلاً ایک یہ کہ وہ ہماری شاعری کے مسلمات متعارفہ کے بارے میں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہیں ۔ اس سے ان کے احساس انفرادیت اور شعور یکتائی کو تقویت ملتی ہے ۔ ان سے قیس ، کوہکن ، منصور اور خضر کوئی بھی نہیں بچ سکا غالب نے ان سب کے مسلم اوصاف کو ناقص قرار دیا ہے ۔ منصور کی تنگ ظرفی ، فرہاد کی خام کاری ، قیس کی بے مصرف صحرا نوردی اور خضر کی بیکار روپوشی ، غالب کے خاص مضامین ہیں ۔

مانع دشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے
خانۂ مجنوں صحرا گرد ، بے دروازہ تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

قطرہ اپنی بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنگ ظرفیٔ منظور نہیں

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

غالب ، بعض اوقات ان مسلمات میں قطع و برید بھی کرتے ہیں ۔ کسی متعارف موضوع کو دیکھنے کا انوکھا اور نیا زاویہ نگاہ تلاش کرتے ہیں ۔ مثلاً مشرقی شاعری میں عاشق صادق ، محبوب کے جور و ستم اور بے وفائی کے باوجود بھی ، باوفا ہی رہتا ہے ۔ لیکن غالب ، کبھی تو عاشق کو بیزار دکھا دیتے ہیں اور کبھی محبوب کو وعدے کا پابند ۔

وفا کیسی ، کہاں کا عشق ، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل ، ترا ہی سنگ آستاں کیوں ہو !

محبت کی سلطنت میں مجنوں اور فرہاد کو بڑا سردار تسلیم کیا جاتا ہے لیکن غالب ان کے عشق و وفا کی بڑائی کو تسلیم تو کرتے ہیں لیکن اپنے آپ کو ان سے بھی بڑا جانتے ہیں ۔

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

غالب ، الفاظ کے بنے بنائے تلازمات کو قبول نہیں کرتے بلکہ اپنے تلازمات بناتے ہیں ۔ وہ اپنے ذاتی و شخصی تجربات کو بھی اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ ہمیں خود اپنا تجربہ محسوس ہوتا ہے ۔

بوئے گل ، نالۂ دل ، دودِ چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا ، سو پریشاں نکلا

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

شیخ اکرام کے بقول ان کے اشعار میں الفاظ ، فقط اظہار مطلب کا ہی وسیلہ نہیں بلکہ شاعرانہ حسن پیدا کرنے کا ذریعہ بھی ہیں ۔ ان کا استعمال اور ترتیب ایسی

ہے کہ معنی اور مضمون سے قطع نظر ، ان کا ترنم اور ہم آہنگی ہی بہت پر لطف ہے -

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

دیر نہیں ، حرم نہیں ، استاں نہیں
بیٹھے ہیں راہ گذر پہ ہم ، غیر ہمیں اٹھائے کیوں

کلام غالب کا ایک حصہ وہ ہے ، جس میں وہ اپنی انا کو دوسرے روپ دیتے ہیں یا پھر کوئی ٹیڑھا راستہ اختیار کرکے ہماری شاعری کے مسلمات سے اپنے رشتہ جوڑتے ہیں -

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

ان کی جدت کا ایک اور طریقہ ہے کہ وہ کسی ایک معروف قصے ، حقیقت یا مسلم روایت کو لے کر اس کی تہہ میں کوئی اور پہلو دار بات پیدا کراتے ہیں -

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

کلام غالب کا ایک حصہ ان اشعار پر مشتمل ہے جن میں غالب نے اپنی جدت پسندی کے تحت ، عام موضوعات سے ہٹ کر ایسے لطیف و نفیس احساسات بیان کیے ہیں ، جو ان سے پہلے کسی نے بیان نہ کیے تھے اور ان کے کلام کا یہی حصہ ، آج سب سے زیادہ مقبول ہے مثلاً

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

نہ کرتا کاش نالہ ، مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعث افزائش درد دروں وہ بھی

اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلئی استاد نہیں

ان اشعار میں جو بنیادی باتیں غالب نے بیان کی ہیں ، وہ اس زمانے کی مسلم باتیں نہیں ہیں بلکہ غالب نے خود محسوس کی ہیں ۔ اس قسم کے اشعار میں انھوں نے اپنی زندگی اور ماحول کو براہ راست دیکھا ہے ۔ اکتسابی علم کے ذریعہ نہیں ۔

اپنی جدت طرازی کا ، خود غالب کو بھی احساس تھا ۔ اسی لیے کہا کہ

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نغز سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

''غالب غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے ۔ ان کی عظمت کا راز ان کی رنگا رنگی ، ان کی دلکش انفرادیت ، ان کی انسانی دوستی اور ان کی آفاقیت میں پوشیدہ ہے ۔ وہ بڑے شاعر ہوتے ہوئے بھی ایک بھرپور انسان تھے جس میں ہر تقاضائے خوبیاں بھی ہیں اور خرابیاں بھی ۔ انھوں نے کبھی اپنی شخصیت پر تہ بہ تہ نہیں ڈالے ۔

وہ جیسے ہیں اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں ۔ یہی بے باک صداقت ، مہذب رندی اور سنجیدہ ظرافت اردو ادب کا سب سے بڑا سرمایہ ہے''۔

(خواجہ احمد فاروقی)

ایس - ایس بھٹی

غالب اور ان کی شاعری

مرزا غالب اور ان کی شاعری اردو ادب میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہے - غالب کی شخصیت پہلو دار تھی اور ہر پہلو اپنے اندر غضب کی کشش رکھتا تھا - غالب اردو شاعری میں اپنے منفرد انداز فکر اور ذہنی اپج کی وجہ سے ایک منفرد مقام کے حامل ہیں - ان کی شاعری ان کی زندگی کا نچوڑ ہے - انہوں نے شاعری کو پیشہ نہیں بنایا خود بھی کہتے ہیں

سو پشت سے ہے پیشہ آباء سپہ گری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

غالب فطرتاً فن کار تھے - وہ اشعار اس لیے کہتے تھے کہ زندگی نے انہیں جو دکھ دیے ہیں ان کو اشعار کے دریا میں بہا دیں - ان کا غم وہ غم نہیں جو میر کی زندگی تھا اور جو میر کے نزدیک نعمت تھا بلکہ غالب کو غم زندگی نے وہ کچھ نہ دیا جس کے وہ متلاشی تھے - وہ زندگی کا رس نچوڑ لینا چاہتے تھے لیکن یہ زندگی انہیں دھوکہ دیتی رہی - مگر انہوں نے اپنی زندگی کے غموں اور دکھوں سے سمجھوتا کر لیا اور ان کا انداز فکر نہایت فلسفیانہ ہو گیا -

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غالب نے اردو کو بہت کچھ دیا اور جو کچھ انہوں نے دیا ہے شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جس پر بڑے بڑے نقادوں نے اپنی آراء کا اظہار نہ کیا ہو - اور یہ حقیقت ہے کہ اگر دیوان غالب کا مطالعہ بغور کیا جائے تو ہمیں اس میں ایک دنیا سمٹی ہوئی نظر آتی ہے - غالب کے ہاں شوخی و ظرافت ، گہرائی و گیرائی ، احساس و جذبہ ، ذہن و شعور ، مذہب و فلسفہ ہر مضمون شامل ہے - غالب کی غزل میں ہمیں احساس و جذبہ کا

مشن بھی نظر آتا ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ ذہن و شعور کی کار فرمائی بھی ۔ اور ان ہی دو خصوصیات میں ان کی عظمت کا راز مضمر ہے ۔ وہ در حقیقت ایک عظیم فن کار تھے اور مندرجہ بالا دو خصوصیات کا حسین سنگم ان کا کلام ہے ۔

غالب نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ نہایت ہی یاس آگیں تھا ۔ سلطنت مغلیہ ایک جاں بہ لب مریض کی طرح آخری سانس لے رہی تھی ۔ ہر طرف مایوسی کی فضا طاری تھی ۔ یقیناً اس وقت کا ادب ماحول سے متاثر تھا ۔ منفی نظریات پیش کیے جا رہے تھے ۔ چاہیے تو یہ تھا کہ غالب بھی میر کی طرح اس ماحول میں جذب ہو جاتے اور خود کو مایوسی کے حوالے کر دیتے ۔ لیکن انہوں نے اپنی اُپج کے لے نیا راستہ منتخب کیا اور منفی نظریات کی بجائے زندگی کے مثبت نظریات پیش کیے ۔ غالب نے اپنے آنسوؤں کے تیل سے نئے چراغ روشن کرنے کی سعی کی ۔

غالب کی شاعری ان کی زندگی کی عکاسی کرتی ہے ۔ غالب کی طبیعت میں شوخی و ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی ۔ ان کے کلام میں ہمیں اکثر اعلیٰ قسم کی ظرافت کے نمونے ملتے ہیں ۔ غالب کے ہاں رکاکت و ابتذال نہیں ہے بلکہ ہلکی پھلکی اور لطیف قسم کی طنز و ظرافت ہے ۔ مثلاً واعظ کو کہتے ہیں ۔

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

ایک اور جگہ واعظ پر چوٹ کی ہے ۔

رات پی زم زم پر مے اور صبح دم
دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

غالب کے ہاں عمومیت بالکل نہیں پائی جاتی ۔ وہ بڑے وضعدار قسم کے انسان تھے ۔ عملی زندگی میں بھی انہوں نے اپنی وضعداری کو نباہا ۔ چنانچہ عشق میں بھی انہوں نے ہار نہ مانی ۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

ایک اور جگہ کہتے ہیں ۔

واں وہ غرور عز و ناز ، یاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں ، بزم میں وہ بلائے کیوں

ان کی تمام زندگی کشاکش روز گار میں گذری ۔ اگرچہ غم جاناں بھی ان کو اذیت

دے رہا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ غم روزگار نے بھی سدا پریشان رکھا کہتے ہیں -

غم اگرچہ جاں گسل ہے ، پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

ایک لا ابالی رئیس کی طرح غالب کو ہمیشہ شراب سے بہت رغبت رہی - ان کے دیوان میں جا بجا ایسے مضامین بھی ملتے ہیں جن میں شراب کا بکثرت ذکر ہے - مثلاً کہتے ہیں -

قرض کی پیتے تھے مے اور سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

ایک اور جگہ کہتے ہیں -

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

غالب کے ہاں ذہنی پختگی ہے- جو انہیں باقی شعراء سے ممتاز کرتی ہے - اور اسی ذہنی پختگی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے روایات سے بغاوت کی ہے -

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سر گشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

لیکن شراب ان کے لیے دکھوں اور غموں کا ذریعہ نجات بن گئی - وہ شراب کے بہت دلدادہ تھے -

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

"شراب" وہ قرض لے کر بھی پیتے تھے - اور سمجھتے بھی تھے کہ ع
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مرزا غالب کے ہاں ہمیں شدید احساس غم کی گہرائی ملتی ہے - لیکن ان کے ہاں غم اور احساس کے شدید جذبے کے ساتھ زندگی سے پیار موجود ہے - وہ زندگی سے اپنا حصہ پورا کرنا چاہتے ہیں لیکن جب ان کا یہ حصہ پورا نہیں ہوتا تو وہ بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں -

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

غالب کے ہاں فلسفیانہ انداز فکر موجود ہے ۔ انکے اشعار میں فلسفے کی گہرائی و گیرائی بھی موجود ہے ۔ ان کے ہاں تصوف کے مضامین بھی بکثرت ملتے ہیں غالب خود بھی ایک جگہ لکھتے ہیں ۔

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب کے ہاں عشق کا تصور بڑا واضح ہے ۔ وہ محبوب کی ہر ادا پر مٹنے کو تیار ہیں ۔ ان کے ہاں عشق کا ہر انداز موجود ہے ۔ وہ محبوبہ بھی موجود ہے جو سرمے سے بھری پلکیں بار حیا سے نہیں اٹھاتی ۔ اور اٹھاتی بھی ہے تو

حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بسوئے دل
ہر تار زلف کو نگاہ سرمہ سا کہوں

اس کے ساتھ ہی ان کے ہاں ایسی بے باک محبوبہ بھی موجود ہے جو دھول دھپا تک کرتی ہے ۔

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیشدستی ایک دن

وہ محبوب کے وعدہ کی حقیقت سے بھی واقف ہیں ۔ اس خیال کا اظہار یوں کرتے ہیں ۔

تیرے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

غالب کے ہاں ذہنی اپج اور جدت خیال و مضموں ہے ۔ وہ ایک عظیم فنکار ہیں ۔ ان کا کلام فن کی انتہائی بلندیوں پر ہے ۔ وہ انسان کی کمزوریوں کو اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان فرماتے ہیں ۔

ناصحا ! مت نصیحت کر دل میرا گھبرائے ہے
میں اسے سمجھوں ہوں دشمن ، جو مجھے سمجھائے ہے

ان کا انداز بیان بھی اپنا جواب آپ ہے غالب کو خود بھی اپنے انداز بیان پر ناز ہے ۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیان اور

اگرچہ غالب نے فارسی میں بہت کچھ کہا ہے - اور انہیں سدا اس بات کا افسوس بھی رہا کہ لوگوں نے ان کے فارسی کلام کی قدر نہیں کی - یہ حقیقت ہے کہ جو شہرت و عظمت ان کے اردو کلام کو حاصل ہوئی وہ فارسی کو حاصل نہ ہو سکی ان کا اردو کلام اردو ادب کا بیش بہا خزینہ ہے - انہوں نے اردو کو فارسی کے مقابل لا کھڑا کیا - وہ خود بھی ایک جگہ اپنے لیے فرماتے ہیں -

پوچھے جو کوئی ریختہ کیوں کر ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کر اسے سنا کہ یوں

یہ ہے بھی حقیقت کہ گفتۂ غالب کی عظمت کا اعتراف تو زمانے نے خود بھی کیا ہے -

باقر علی سحر

غالب کی مشکل پسندی

غالب کی جدت پسند طبع انہیں مجبور کرتی تھی کہ وہ پڑے ہوئے راستوں سے ہٹ کر اپنے لیے ایک نئی شاہراہ تیار کریں چنانچہ اس شوق میں انہوں نے میر اور دیگر ہم عصر شعرا کی سادہ نگاری کو چھوڑ کر مشکل پسندی کو اپنایا ۔

دراصل جس ماحول میں غالب نے آنکھ کھولی اس میں فارسی گوئی کا چراغ اپنی پاوری آب و تاب کے ساتھ روشن تھا ۔ چنانچہ اس وقت کے رواج کے مطابق غالب نے فارسی کی تعلیم حاصل کی اوراس زبان میں ان کے استاد مشہور عالم فارسی اور ایرانی نژاد ملا عبدالصمد تھے ۔ فطری رجحان اور استاد کامل کی صحبت نے ان کی طبیعت کو جلا دی اور وہ بچپن ہی میں فارسی میں شعر کہنے لگے ۔ ان کے ابتدائی کلام میں فارسیت کا گہرا رنگ چھایا ہوا ہے ۔ بعض اشعار میں اردو کے ایک یا دو لفظ ہیں اگر انہیں بدل دیا جائے تو شعر فارسی کا بن جاتا ہے ۔مثلاً اس کو لے لیجیے ۔

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
ہوائے سیر گل آئینہ بے مہری قاتل
تماشائے بہ خون غلطیدن بسمل پسند آیا
بہ فیض بے دلی نومیدی جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

جیسا کہ حالی نے لکھا ہے کہ مرزا عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک بھوں چڑھاتے تھے ۔ اسی لیے یہ مزاج شعر و شاعری میں ظاہر ہوا تو یہاں بھی اس نے اپنا الگ راستہ بنانے کی کوشش کی ۔ سب سے الگ چلنا اور سب سے الگ راستہ اختیار کرنا ان کے مزاج کی خصوصیت تھی ۔ چنانچہ انہوں نے ایسی شاعری نہیں کی کہ جیسا اس

زمانے میں رواج تھا کہ شعر ایسا ہو ادھر شاعر کی زبان سے نکلا ادھر سامع کے دل میں اتر گیا - اسی وجہ سے وہ بیدل کے راستے پر پہنچ گئے سوچا جو کلام بیدل نے فارسی میں کیا - اگر وہ اردو میں کر جائیں تو سب سے الگ رہیں گے - چنانچہ انہوں نے فارسی کے اس عظیم شاعر کے کلام کا بغور مطالعہ کیا -

مرزا بیدل اپنی دقت پسند اور مشکل گوئی کے لیے مشہور ہیں چنانچہ غالب نے شعوری طور پر بیدل کے رنگ میں شعر کہے -

اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے -

مجھے راہ سخن میں خوف گمراہی نہیں غالب
عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

مطرب دل نے میرے تار نفس سے غالب
ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا

اگرچہ انہیں تسلیم کرنا پڑا کہ

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

مرزا مغل خاندان کے فرد تھے - پیشہ آبا سپاہ گری تھا اوز وہ اس بات پر فخر کرتے تھے - ان کی ذاتی خود داری اور انانیت نے ان میں ایک عظمت پیدا کر دی تھی - وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے - یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کئی لوگوں کو ناراض کر لیا تھا - اگر لوگ کسی کے کلام کو بطور سند پیش کرتے تھے تو مرزا غالب یہ کہہ کر ٹال دیتے تھے کہ اگلے زمانے میں احمق نہیں ہوتے تھے - ہند کے فارسی گو شاعروں کو فارسی میں سند نہیں مانتے تھے - شاعری میں میر - سودا ، میر حسن اور ذوق کا لوہا مانا جاتا تھا - یہ شعرا سادہ نگاری پر زور دیتے تھے - غالب اس عام روش سے ہٹ کر مشکل پسندی کا راستہ اختیار کیا اور اس پر فخر کرنے لگے-

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

مشکل ہے ز بس میرا کلام اے دل
سن سن کر جسے سخن وران کامل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

خیال و الفاظ عام فہم نہ تھے ۔ ان کے اشعار کو سمجھنے کے لیے دماغ سوزی اور قابلیت کی ضرورت ہوتی تھی ۔

غالب کی اس مشکل‌پسندی کو لوگوں نے پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھا۔ اگرچہ اس نے نیا پن تو پیدا کر دیا تھا لیکن ذوق و شیفتہ کے مقابلے میں ان کی مشکل پسندی کو کسی نے نہ سراہا ۔ ایک دفعہ حکیم آغا جان عیش نے یہ قطعہ کہہ دیا ۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

ایسے اشعار سن کر مرزا بھنا کر رہ جاتے اور یوں ٹال دیتے
نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
نہ سہی گر میرے اشعار میں معنی نہ سہی

محمد حسین آزاد نے بھی مرزا کی مشکل پسندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ مرزا اگرچہ سب سے پیچھے آئے لیکن کسی سے پیچھے نہ تھے ، آتے ہی ایک ایسا نقارہ بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیے ۔ کوئی سمجھا کوئی نہ سمجھا مگر واہ وا کرنے لگے ۔

آخر کچھ دوستوں کے مشورے اور وقت کے تقاضوں کے مطابق انھوں نے اس بات کو جلد ہی محسوس کر لیا کہ علمیت کی نمائش کا یہ طریقہ صحیح نہیں بلکہ اس قسم کا کلام اپنے دیوان سے خارج کر دیا ۔ دیوان غالب کے قدیم ترین نسخے کی دریافت سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ غالب نے ان اشعار کا انتخاب نہیں کیا جن میں ابلاغ وغیرہ کی کوئی خامی تھی ۔ اس کے ساتھ ساتھ بیدل کی پیروی بھی ترک کر دی ۔ چنانچہ دوسرے دور میں مشکل پسندی ، ژولیدگی اور فارسی تراکیب اور بندشوں وغیرہ میں کمی آ گئی ۔ اس کی جگہ سادہ زبان استعمال کی مگر اس سادگی میں پرکاری ہے ۔ ان کی تنقیدی صلاحیتوں کا اندازہ ان کی اپنی اصلاحوں سے لگایا جا سکتا ہے ۔ مثلاً ذیل کے اشعار دیکھیے ۔

اصل شعر
اب میں ہوں اور جنون دو عالم معاملہ
توڑا جو تونے آئینہ تمثال دار تھا

اصلاح — اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

اصل شعر — عشرت ایجاد چہ بوئے گل و چہ دود چراغ
جو تری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا

اصلاح — بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا

چنانچہ آخری دور میں وہ نہایت پرکاری سے بلند خیالات اور لطیف جذبات کو سلیس اور سادہ زبان میں پیش کرتے تھے ۔ اگرچہ بظاہر سادہ ہیں لیکن ان میں معانی کی کئی تہیں ہوتی ہیں اور ان کے اشعار سہل ممتنع کا عمدہ نمونہ بن جاتے ہیں ۔

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی
موت کا اک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

اور یہ غزل

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اس طرح جب فارسیت اور نازک خیالی لطیف شعریت میں ڈھل گئی تو غالب غالب بن گئے ۔

محمد انیس انصاری

غالب کوچۂ یار میں

ایک مقولہ ہے لیلیٰ کو چاہو تو سگ لیلیٰ کو بھی عزیز جانو ۔ چنانچہ عشاق حضرات اسی مقولے پر عمل کرتے ہوئے بسا اوقات ان چیزوں پر فریفتہ نظر آتے ہیں جو بظاہر تو معمولی ہوتی ہیں لیکن محبوب سے تعلق رکھنے کی بنا پر وہ ان کی نظروں میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہو جاتی ہیں ۔

لیلیٰ کو ہی لیجئے ۔ اس کا ذکر چلا تو اس کے چاہنے والوں نے اس کے کتے تک کو نہ بخشا ۔ اسے ایک ٹانگ سے گھسیٹا اور شاعری میں لا کھڑا کیا ۔

''کوچۂ یار'' اور ''آستان یار'' بھی ''سگ لیلیٰ'' کی طرح ایسے موضوعات ہیں جن پر عرصۂ دراز سے قلم فرسائی ہو رہی ہے ۔ غالب کے ہاں اگرچہ یہ موضوع نیا نہیں لیکن ان کے منفرد اسلوب نگارش نے اس موضوع کو متنوع اور منفرد ضرور بنا دیا ۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ''کوچۂ یار'' آزمودہ موضوع ہے ، مختلف شعراء کے کلام سے ایسے اشعار مل سکتے ہیں جو اس ضمن میں لکھے گئے ۔ خاص طور پر میر نے اس موضوع کو وسعت بخشی ۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ میر نام ''عشق و محبت'' کے لیے مخصوص ہو چکا ہے ۔ ایسا عشق جو حزن و الم پہ منتج ہوا ۔ کلام میر اسی واردات قلبی کا آئینہ دار ہے ۔ تذکرہ کوئے یار بھی ان کی ناکامی کی طرف ایک اشارہ ہے ۔

یوں اٹھے آہ اس کی گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے
دل مجھے اس گلی میں لے جا کر
اور بھی خاک میں ملا لایا

میر درد اگرچہ تصوف کی چھاپ تلے آ ہی گئے تھے لیکن کشاں کشاں وہ بھی عشق مجاز کی طرف بھٹک ہی پڑے ۔

اب کی تیرے در سے گر گئے ہم
پھر یہ ہی سمجھ کہ مر گئے ہم

آتش کوچہ‌ٔ یار کو کوچہ‌ٔ قاتل سے کم نہیں سمجھتے
پتہ یہ کوچہ‌ٔ قاتل کا سن رکھ اے قاصد
بجائے سنگ نشاں اک مزار راہ میں ہے

مرزا سودا نے تو مبالغے کی حد کر دی ۔

نسیم ہے تیرے کوچے میں اور صبا بھی ہے
ہماری خاک سے دیکھو تو کچھ رہا بھی ہے

کم و بیش اسی خیال کو غالب نے بھی مبالغے کا لبادہ اوڑھایا ہے ۔

اڑتی پھرے ہے خاک میری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوس بال و پر گئی

مومن محبوب کی گلی میں جان دنیا عین سعادت کیا ۔ ۔ ۔ منتہائے مقصود تصور کرتے ہیں ۔

اس کوچہ میں مریں گے مدد اے ہجوم شوق
آج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم

ظفر کو بھی اواخر عمر میں حسرت ہی رہی ۔

کتنا ہے بد نصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں

کوچہ‌ٔ یار کے متعلق عصر رفتہ کے چیدہ چیدہ شعراء کے خیالات تو سن ہی لیے آپ نے ۔ آئیے اب غالب کی طرف چلیں ۔

اردو شاعری کا یہ بطل جلیل بھی میر کی طرح عشق کی تلخیوں سے دو چار ہوا ۔ اس کی ناکام آرزوئیں ہی در حقیقت اس کے کلام کی جان ہیں ۔ اگر غالب حقیقت سے پہلو تہی کرتا تو شاید اس کے کلام میں درد و الم کی یہ چبھن نہ ہوتی ۔ میر کی طرح اسے بھی حوادث عشق سے گزرنا پڑا ۔ اپنے ایک ایسے ہی ناکام عشق کا اظہار وہ حاتم علی مہر کی محبوبہ کی وفات پر تعزیت کے ایک مکتوب میں کرتے ہیں ۔

''مغل بچے بھی غضب کے ہوتے ہیں - جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں - میں بھی مغل بچہ ہوں عمر بھر ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے - خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں - مغفرت کرے - چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا اس فن میں بیگانہ محض ہو گیا ہوں لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں - اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا'' -

مکتوبات کے علاوہ شاعری میں بھی غالب نے اپنی آپ بیتیوں کا ذکر کیا ہے -

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تیری غفلت شعاری ہائے ہائے
عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے
شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

ایک اور مرثیے سے یہ بات اخذ کی جا سکتی ہے کہ کلکتہ کے قیام کے دوران بھی بتان خود آرا کے حسن سے متاثر ہوئے تھے -

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتان خود آرا کہ ہائے ہائے

علی ہذالقیاس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عشق کی مختلف منازل سے گزرتے ہوئے غالب ، بادہ پیا بن جاتا ہے ، کہیں آستان یار تک رسائی کے بعد جلوۂ یار کا مشتاق ہوتا ہے اور کہیں عمر اسی کوچے میں تمام کرنے پر بضد نظر آتا ہے -

آئیے ذرا دیکھیں کہ کوچۂ یار میں غالب پر کیا گزر رہی ہے -

لیجیے تلاش بسیار کے بعد موصوف پہنچ ہی گئے محبوب کی گلی تک بھی - - اب صورت حال یہ ہے کہ غالب در یار پہ پڑے رہنے کی استدعا کر رہے ہیں - - آپ سمجھتے ہیں نا کن سے - - - ٹھیک بالکل ٹھیک سمجھے - - - لیجیے حضرت اجازت بھی مل گئی لیکن یہ دوسرے لمحے کچھ اور ہی منظر ہے -

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

لیکن غالب بھی تو غالب ہے ۔ مغلوب تو نہیں ـــ چنانچہ ہٹ دھرمی ملاحظہ ہو ۔

موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستان یار سے اٹھ جائیں کیا

غالب غالب آنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا میری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

ابھی حضرت موت کے آگے بھوت ناچے ـــ بھلا پاسبان بخشے ہے خستہ جان غالب کو ـــ دیکھ لو غالب بھاگے جا رہے ہیں ، بستر بوریا چھوڑ چھاڑ کے ۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

سنا آپ نے ـــ کیا ورد جاری ہے مرزا کی زبان پر ۔

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
میری قسمت میں یا رب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

پھر بے خودی میں بھول گیا زاہ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ تیرے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

بعد یک عمر ورع بار تو دیتا بارے
کاش رضواں ہی در یار کا درباں ہوتا

پھر تیرے کوچے کو جاتا ہے خیال
دل گم گشتہ مگر یاد آیا

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

مرزا صاحب آپ کو یاد ہوگا ایک مرتبہ آپ نے کہا تھا ۔

دائم پڑا ہوا تیرے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کتنی خود داری تھی اس شعر میں لیکن خیر جو ہوا سو ہوا — چھوڑو قصہ کوئے یار کو اب تو آپ ڈھب پر آ ہی گئے نا ۔

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

ایم اسلم کوثر - سال چہارم

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

مرزا غالب حادثات زمانہ کے شکار رہے لیکن انہوں نے غم و الم کے باوجود زندگی سے دلچسپی برقرار رکھی اور جینے کی آرزو کرتے رہے - انہوں نے ہمیشہ ہی غم و الم سے نباہ کیا - اپنے دل کو تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں -

غم اگرچہ جانگسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا ، غم روزگار ہوتا

غالب نے زندگی میں جس بات کی تمنا کی وہ کبھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچی - ان کے ارمان اگرچہ بہت نکلے مگر پھر بھی ان کے دل میں اس بات کی حسرت رہ گئی کہ

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

مسلسل غموں کو برداشت کرتے کرتے آن کو غم سہنے کی عادت ہو گئی تھی اسی لیے وہ غم سے گھبراتے نہیں بلکہ بڑے دعوےٰ سے کہتے ہیں -

رنج سے خوگر ہو انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

مرزا غالب نے اپنی آرزوؤں کی شکست پر ہمت نہ ہاری - پھر بھی سینہ سپر رہے اور رنج و غم کو مسکرا کر سینے سے لگاتے رہے کیونکہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جب تک انسان زندہ ہے اسے غم و آلام سے ہی واسطہ رہے گا اور جب مر جائے گا تو شاید نجات مل جائے -

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

انہوں نے ہمیشہ غم میں خوشی کو تلاش کیا اور کرب کی حالت میں بھی مسکراتے رہے ۔ وہ زندگی کے آرزو مند تھے وہ اپنی ہار میں بھی جیت کو تلاش کرتے تھے اور قسمت آزمائی کے لیے تیار رہتے تھے ۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

اُن کے کانوں میں سدا ہی غم کے نغمے گونجتے رہے لیکن وہ ان سے کبھی بیزار نہیں ہوئے وہ اس لیے کہ انہیں معلوم تھا کہ دنیا بے ثبات ہے ایسا نہ ہو کہ وہ خوشی کے گیت کی تلاش میں نغمۂ غم کو ہی کھو بیٹھیں ۔ وہ اسے بھی غنیمت جانتے ہیں ۔

نغمہ ہائے غم کو ہی اے دل غنیمت جانئے
بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نغمۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

مرزا بڑے ضبط کے ساتھ رنج و الم کو برداشت کرتے ہیں ۔ لیکن آخر وہ بھی تو انسان ہیں ۔ کبھی کبھی ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے تو اپنے مجروح اور شکستہ دل سے دکھ بھری آواز کے ساتھ خدا سے شکوہ کرتے ہیں ۔

مری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے

ان کے کلام میں درد و غم کی چھپی ہوئی کسک اور حزن و ملال کی یہ کیفیت وقت اور حالات کے تقاضوں کا نتیجہ تھی ۔ مرزا حوادث زمانہ سے بری طرح متاثر ہوئے ۔ مسلسل احساس محرومی مسلسل اضطراب و نا آسودگی ، رنج و غم حسرت و الم اور یاروں کی بے وفائی نے حساس دل کو بے حد متاثر کیا تھا ۔

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہرئ یاران وطن یاد نہیں
جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

ان کا غم ایک مجبور و بے کس انسان کا غم ہے ۔ جس کی زندگی کا ہر لمحہ تڑپتے ہوئے گزرا ہے ۔ وہ اشعار میں اپنے درد کی کسک کو اس طرح بیان کرتے کہ قاری کو اس کا ہر زخم اپنا گھاؤ نظر آتا ہے ۔ ان کی زندگی میں غموں کو بہت

دخل تھا ۔ مگر انھوں نے بلند ہمتی کا ثبوت دیا ہے اور غم کے سامنے بالکل ہتھیار نہیں ڈالے ۔

نہیں نگار کو الفت نہ ہو ، نگار تو ہے
روانیٔ روش و مستی ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوت چمن و خوبی ہوا کہیے

غالب کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان کی تخلیق ایک عظیم ترین مقصد کے تحت ہوئی لیکن اس دنیا میں آ کر اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جس کردار و گفتار کی ضرورت ہے وہ ہر آدمی کے لیے آسان نہیں اور پھر انسان کو اس زندگی میں غم و آلام سے واسطہ پڑتا ہے ۔ وہ اگر ان غموں سے گھبرا گیا تو اس دنیا کے امتحان میں ناکام رہا اور اگر حوصلہ مندی سے کام لیا تو وہ اپنے مقصد میں پورا اترے گا ۔

وہ زندگی کی مسرتوں اور نعمتوں سے بھی لطف اندوز ہوئے اور اس کی محرومیوں اور صعوبتوں سے بھی دو چار رہے ۔ ان کے نزدیک زندگی ایک شمع کی مانند ہے جسے صبح ہونے تک سکون ہو یا طوفان جلتے رہنا بہت ضروری ہے ۔

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر حال میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ظفر حسین

غالب کی شخصیت اور فن

اگر آپ بڑی شخصیتوں سے ملیں - یا ان کے حالات زندگی پڑھیں - تو آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ بڑی شخصیتوں میں عام طور پر کوئی نہ کوئی جسمانی یا مادی کمزوری ہوتی ہے - اور یہی جسمانی یا مادی کمزوری انہیں آگے بڑھنے کی طرف مجبور کرتی ہے - اگر ان کے اندر ایسی خامی نہ ہوتی تو وہ کبھی بھی بڑے آدمی نہ بن سکتے - جس طرح ایک اندھے کے اندر محسوس کرنے کی ایک چھٹی حس بیدار ہوتی ہے - اور ایک بہرے کے اندر اشاروں کے جانچنے کے لیے ایک صلاحیت ابھرتی ہے - اسی طرح ہر کمی کو پورا کرنے کے لیے انسان اپنے اندر کوئی نہ کوئی خوبی پیدا کرنے پر مجبور ہوتا ہے - نپولین کا قد اگر چھوٹا نہ ہوتا تو وہ شائد ایک عظیم جرنیل نہ بن سکتا - برنارڈ شا کو اگر اپنی بد شکلی کا احساس نہ ہوتا تو اس کی ذہنی صلاحیتیں سسک سسک کر دم توڑ دیتیں - سعادت حسن بےچارگی کا شکار نہ ہوتا - تو وہ کبھی بھی منٹو نہ بنتا - اسی طرح ہی اگر مرزا غالب مصائب و آلام کا مزا نہ چکھتے تو کبھی یہ نہ کہتے -

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

زبان اردو کے بہت بڑے ماہر - اپنے زمانے کے استاد کامل فلسفی شاعر مرزا اسد اللہ خان تخلص بہ اسد و غالب ۱۷۹۷ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے - لقب مرزا نوشہ تھا اور خطاب نجم الدولہ، دبیر الملک نظام جنگ - مرزا کو جس طرح اپنی ذاتی قابلیت پر ناز تھا اسی طرح اپنی ذات اور اعلیٰ خاندان کا فرد ہونے پر بھی بڑا فخر و ناز تھا جیسا کہ ان کے اکثر اردو فارسی کلام سے ظاہر ہوتا ہے -

غالب از خاک پاک تو رانیم
لا جرم در نسب فره مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی
بستر گان قوم پیوندیم !

مرزا غالب نے شاعری کی ابتدا بچپن ہی سے کی - دس سال کی عمر تھی کہ ایک فارسی کی غزل استاد کی خدمت میں اصلاح کے لیے پیش کی - تیرہ سال کی عمر میں مرزا غالب کی شادی نواب الٰہی بخش معروف کی بیٹی کے ساتھ ہوئی - نو عمر غالب کی نوخیز طبیعت پر شادی کا گہرا اثر پڑا - شروع میں فارسی میں شعر کہتے تھے اور اس میں بہت کچھ کہا - مگر رفتہ رفتہ اردو شاعری کی روز افزوں ترقی اور ماحول کے اثر سے اردو کی طرف توجہ دی - پہلے اسد تخلص رکھتے تھے - جب کسی شخص کا یہ شعر سنا -

اسد تم نے یہ غزل بنائی خوب ارے او شیر رحمت خدا کی

یہ سنتے ہی اس تخلص سے نفرت ہو گئی - چنانچہ اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب کی رعایت سے غالب تخلص اختیار کیا - لیکن جن غزلوں میں اسد تخلص تھا - انہیں اسی طرح رہنے دیا -

مرزا غالب کی شخصیت کو صرف شاعری تک محدود رکھنا ان کے ساتھ سرا سر بے انصافی ہے - جہاں اردو ادب ان کی شاعری کی وجہ سے مرزا صاحب کی ممنون احسان ہے - وہاں اردو شعر بھی ان کی شخصیت کے سامنے سر بسجود ہے -

سب سے پہلے ہم مرزا غالب سے بطور ایک شاعر کے متعارف ہوتے ہیں - اور شاعری میں آن کی شخصیت کا عکس دیکھتے ہیں - مرزا غالب کی عظمت شاعری کا راز زیادہ تر آن کی غزل گوئی میں ہے - اگرچہ خود غالب اپنی غزل کو بے رنگ کہہ کر اس سے گزر جانے کا مشورہ دیتے ہیں لیکن دوسروں کو آن کی بے رنگ شاعری میں ہی وہ رنگ نظر آتا ہے جس کے سامنے کسی اور ہ رنگ نہیں جمتا - اسی شاعری ہی سے تو خورشید الاسلام اس قدر متاثر ہیں کہ وہ یہ بھی کہنے سے گریز نہیں کرتے کہ غالب وہ دیوزاد ہیں جن کے سامنے دوسرے شاعر بونے نظر آتے ہیں -

عبدالرحمن بجنوری غالب کے دیوان کو الہامی کتاب کہتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ لوح سے تمت تک سو صفحے ہیں - لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں - کونسا نغمہ ہے جو اس زندگی کے ساز میں بیدار یا خوابیدہ نہیں -

جبکہ کلیم الدین احمد غالب کو سرے ہی سے بڑا شاعر نہیں مانتے کہتے ہیں ۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ غالب ادب میں خدائے سخن ہے۔جس کی عظمت کے سامنے لوگ سجدہ ریز ہو جاتے ہیں ۔ اور جن کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا ، وہ اُس کے وجود ہی سے منکر ہو جاتے ہیں ۔

اردو ادب میں غالب کی شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے ۔ اتنا لکھا گیا ہے ۔ کہ شائد ہی کسی اور شاعر پر لکھا گیا ہو ۔ پھر بھی آج تک اُن کی شاعری کے متعلق دو ٹوک فیصلہ نہیں ہو سکا ۔

غالب کی شاعری کا تجزیہ کرنا بہت ہی مشکل ہے ۔ البتہ مختصر جائزہ لینے پر مندرجہ ذیل خوبیاں نظر آتی ہیں ۔

مشکل پسندی :۔ غالب طبعاً جدت پسند تھا ۔ طرز نازک خیالی کے متبعین کی خصوصیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حقائق شعری کو سیدھے سادھے الفاظ میں کہنے کی بجائے وہ مضمون کو تخیل کی پیچیدہ گھاٹیوں سے گزارتے ہیں ۔ اور اسی اشکال میں وہ اپنی خصوصیت اور ناموری سمجھتے ہیں ۔ بعض اوقات اُن کی یہ مشکل پسندی اس قدر بلند بانگ ہو جاتی ہے کہ شعروں کا مطلب اور اثر بالکل جاتا رہتا ہے ۔ ایسے ہی اشعار پر کوہ کندن وکاہ بر آوردن ،، کی مثل پوری طرح صادق آتی ہے ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ غالب نے یہ مشکل پسندی طالب آملی اور بیدل سے سے متاثر ہو کر اختیار کی تھی ۔ اور سند میں یہ شعر پڑھتے ہیں ۔

اسد ہر جاسخن میں طرح باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگ بہار ایجادیٔ بیدل پسند آیا

مگر خود غالب نےاس عقدے کا جو حل پیش کیا ہے ۔ وہ یہ ہے ”شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو جتائی ۔ طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ بالکل فنا کر دیا ۔ ظہوری نے اپنے کلام کی گہرائی سے میرے بازو پر تعویز اور کمر میں زاد راہ باندھا ۔ اور نظیری نے اپنی روش خاص پر مجھ کو چلنا سکھایا ۔ اب اس گروہ والا شکوہ کے فیض سے میرا کلک رقاص چال میں کبک ہے ۔

مگر جب حکیم آغا جان عیش نے جل کر یہ کہا ۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

تو مرزا کی اصلاح پسند طبیعت نے وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنی روش آہستہ آہستہ بدل ڈالی - اور آخرکار ان کا کلام عام فہم ہونے کے ساتھ ہی بلیغ بھی ہو گیا -

(۲) اختصار و ایمائیت:—ایک نقاد کے الفاظ میں غزل اظہار کا نہیں بلکہ اخفا کا ذریعہ ہے - اس میں دل کی بات کو استعاروں میں چھپایا جاتا ہے - غالب بہت بڑے مضمون کو اشاروں و کنایوں میں اسطرح ادا کرتے ہیں کہ جتنا سوچئے اتنا لطف شعر بڑھتا جاتا ہے - ان کا ہر شعر ایک ساز ہوتا ہے جس کے بہت سے پردوں میں کتنی آوازیں پنہاں ہیں -

مثلاً

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا میری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے
آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پر کتنا غرور تھا -

(۳) حقائق نگاری:—مرزا ایک بہت بڑے فلسفی ہیں اور ان کے اکثر اشعار حقائق فلسفہ کو نہایت آسانی اور سادگی سے ظاہر کرتے ہیں وہ رموز و حقائق تصوف سے پوری طرح واقف اور فرقہ بندی اور تعصب سے پاک ہیں

فرماتے ہیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

ان کے یہ خیالات یونہی نہ تھے - بلکہ ان پر مکمل عمل بھی کرتے تھے - ان کی زندگی مذہبی رواداری آزادہ روی کی ایک درخشاں مثال تھی اسی طرح ان کا تخیل عبادت بھی بہت بلند ہے - کہتے ہیں

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

عام لوگوں کا جنت کے متعلق یہ خیال کہ اس میں دودھ کی نہریں ہوں گی - اور دنیا سے کہیں بڑھ کر عیاشی کے سامان ہوں گے - اس سے مرزا متفق نہیں - بلکہ

اس کو اخلاق اعلیٰ سے گرا ہوا سمجھتے ہیں

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ایک جگہ تو جنت کو دوزخ میں ڈالنے کا مشورہ دیتے ہیں

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

بحثت ایک صوفی صافی کے وہ دنیا کے شادی و غم سے بالکل متاثر نہیں ہوتے بلکہ ایک مرتفع مقام سے ترانہ سنجی کرتے ہیں۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

خود ہی اندازہ لگائیے کہ مرزا صاحب کس قدر خوبصورتی سے اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ عالم ظاہر مظہر روح حیات ہے۔ مگر خود روح حیات نہیں ہے۔ گویا یہی روح حیات اجسام میں جلوہ گر ہے، مگر وہ خود اس عالم سے منزہ ہے۔ غالب کہتے ہیں

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

(۴) زندگی کی آرزو :۔غالب نے اپنی شاعری میں ایک بے فکرے کردار کو پیش کیا ہے جو ناکامیوں کو خاطر میں نہیں لاتا اور آن سے بد دل ہوتا ہے۔ انسانی عزم کی بلندی دیکھئے: کہ ہجوم نامرادی بھی خاک میں مل جاتی ہے۔ دنیا کی بے ثباتی کے احساس کے باوجود زندگی کو پا لینے کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔ غالب کسی بھی میدان میں دوسروں کی ہزیمت کو دیکھکر ہتھیار نہیں ڈالتے۔ بلکہ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھنا چاہتے ہیں

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

وہ نیاز مند عاشق ہونے کے باوجود اپنی انا کو مجروح نہیں کرنا چاہتے بلکہ کہتے ہیں کہ

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں ؟ کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

یہ پاس وضع غالب محبوب ہی تک نہیں نبھاتے بلکہ خدا کے گھر تک اُس کا خیال رکھتے

ہیں ۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

(۵) موثر لب و لہجہ :۔غالب کی آواز میں قوت جوش ، بلند آہنگی ، تندی اور تیزی کا امتزاج ہے ۔ ان کے لب و لہجہ میں بے پناہ زندگی ہے ۔ وہ نہ تو مجنوں فرہاد کو خاطر میں لاتے ہیں ۔ نہ خضر و الیاس کا سہارا ڈھونڈتے ہیں ۔ بلکہ طنز کرتے ہیں ۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سر گشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

یہی قاہرانہ پن آن کے فارسی کلام میں بھی ہے ۔

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگر دانیم
قضارا بہ رطل گراں بگر دانیم

(۶) جوش‌انگیز بیان :۔سخت کوشی ۔ جنون و آشفتگی ۔ خود کا شعور ۔ طلب دوام کے اعتبار سے غالب کی شاعری کو اقبال کی منزل اول قرار دیا جا سکتا ہے ۔

(۷) شوخی و ظرافت:۔مرزا کی شاعری میں جو مایوسی اور درد کی تاریکی ہے، اس کو آن کی طبعی ظرافت اور شوخی اکثر دور کر دیتی ہے ۔ اکثر اشعار میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حزن و یاس کے ابر میں ظرافت کی دھوپ نکل آئی ہے آنکی ظرافت کی لطافت اور شوخی کلام کی نزاکت کو ہم بے تکلف ایک نازک پھول کے ساتھ تشبیہہ دے سکتے ہیں ۔ مگر آن کی ظرافت کبھی حد اعتدال سے بڑھ کر پھکڑپن نہیں ہو جاتی ۔ اور متین سے متین آدمی آن سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں ۔

(۸) واردات عشق:۔غالب غزل کے شاعر ہیں اور آن کے یہاں عشق کی رنگارنگ تصویریں ملتی ہیں ۔ وصل کی حسین یادیں ۔ ہونٹوں کی شیرینی ۔ دشنام کی لذت چھیڑ چھاڑ ، دیوانگی شوق ، اور پاکدامنی کا خیال شرم و رسوائی کے ساتھ در پر پڑے رہنے کی خواہش ۔ آن کے خیالات واردات قلبی اور جذبات انسانی کی نفسیات کی آئینہ‌دار ہیں ۔ انہی خصوصیات نے آن کی شاعری میں رنگینی اور رعنائی پیدا کی ہے ۔

بقول اقبال

زندگی مضمر ہے تیری شوخیٔ تحریر میں
تاب گویائی سے جنبش ہے لب تصویر میں

تو لیجئے صاحب ! آپ مرزا صاحب سے بطور شاعر کے متعارف ہو ہی گئے ہوں گے ۔ آئیے اب ذرا مرزا غالب کو بطور ایک نثر نگار کے ملیں کہ نثر نگاری میں انہوں نے کیا کچھ کہا ہے ؟

غالب اپنے وقت کے بہت بڑے فارسی دان تھے ۔ اور انہیں خود بھی اپنی فارسی دانی پر فخر تھا ۔ نظم ہو یا نثر دونوں ہی فارسی میں لکھتے تھے ۔ اور اس میدان میں اپنی اُستادی پر ناز کرتے ۔ ۱۸۵۰ء میں آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر نے انہیں خاندان مغلیہ کی تاریخ نویسی پر مامور کیا ۔ چونکہ وہ تاریخ لکھنے میں بے حد مصروف رہتے تھے ۔ لہٰذا اُن کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ فارسی میں دوستوں کو خطوط لکھیں لہٰذا اسی مجبوری کے تحت مرزا صاحب نے اردو میں خط لکھنے شروع کئے ۔ انہیں کیا علم تھا کہ اُن کی یہ تن آسانی اُن سے جدید اردو نثر کا سنگ بنیاد رکھوائے گی ؟ غالب کے اردو خطوط پڑھکر ان کے دوستوں کو اندازہ ہوا کہ غالب کی نظم کی طرح اُن کی اردو نثر بھی بڑی بلندیوں تک پہنچتی ہے ۔ اور اُن کے خطوط اردو نثر کی تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں ان حضرات کے اصرار پر خطوط کو یک جا کر کے یکے بعد دیگرے دو مجموعوں میں اردو معلی اور عود ہندی کے نام سے اشاعت کی گئی ۔

دراصل مرزا غالب سے پہلے اردو نثر میں مرصع انداز مروج تھا۔لوگ سیدھی سادھی بات کو اتنے مشکل طریقے سے لکھتے تھے کہ عام آدمی کی فہم سے وہ بالاتر ہو جاتی تھی ۔ اور اسی انداز کو اپنے عالم ہونے کی دلیل خیال کرتے ۔ غالب نے اپنے خطوط میں سادہ اور سلیس نثر استعمال کی انہوں نے وہی زبان استعمال کی جو گھروں اور بازاروں میں بولی جاتی ہے ۔ اسی زبان کی سادگی سے جو رنگینی پیدا ہوتی ہے ، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ یہی سادگی کا حسن غالب کے خطوط میں بڑی نکھری ہوئی صورت میں موجود ہے ۔

غالب نے اپنے خطوط میں اکثر اوقات گفتگو کا انداز اختیار کیا ہے ۔ ایسے خطوط پڑھنے کے بعد خیال آتا ہے کہ دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے ہیں ۔ غالب جان بوجھ کر یہ مکالماتی انداز اختیار کرتے تھے خود ایک خط میں لکھتے ہیں ”میں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے ۔ دور بیٹھے بزبان قلم باتیں کیا کرو ۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو“ غالب نے خط میں بالکل ایک بے تکلفی کی فضا قائم کی ہے ۔ اس بے تکلفی نے خلوص کی حدوں کو چھو لیا ہے ۔ اور یہی تو غالب کے قلم کا اعجاز ہے ۔ چونکہ غالب حیوان ناطق کی بجائے حیوان ظریف تھے ۔ لہٰذا تاریک سے تاریک موقعوں پر بھی اُن کی ظرافت اور لطافت کی بجلی چمک جاتی ہے ۔ جس سے

مصائب کی تیرگی کا فور ہو جاتی ہے ۔ اُن کی ظرافت میں کسی قسم کی تیزی اور بدمزگی نہیں ہوتی ۔ بلکہ اس میں مناسبت اور جدت اسلوب کے ساتھ ہمدردی کی جھلک نظر آتی ہے ۔ وہ اپنی ظرافت سے کسی کو نہیں بخشتے ۔ حتیٰ کہ اپنی بیوی کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں ، کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے ۔ نو نہ پھندا ٹوٹتا ہے ۔ نہ دم نکلتا ہے ۔

اپنی وفات کی پشین گوئی کے متعلق ظریفانہ انداز میں لکھتے ہیں میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی ۔ مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا ۔ واقعی اس میں میری کسر شان تھی بعد رفع فساد جو ہوا سمجھ لیا جائے گا ۔

مذہب کی پابندیوں کو اپنے قریب ہی نہ پھٹکنے دیتے تھے ۔ حتیٰ کہ رمضان شریف میں بھی اپنی کوٹھڑی میں ہاتھ میں جام اور حقہ لئے بیٹھے گڑ گڑا رہے ہوتے چونکہ آخر عمر میں مختلف امراض و آلام نے مرزا غالب کو بہت پریشان کر دیا تھا ۔ پھر اس زمانہ میں آن کی مالی حالت بھی درست نہ تھی ۔ ایسی صورت میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ اپنے افکار و مصائب کو شراب نوشی سے ہلکا کرتے ۔ چھپ چھپا کر نہیں ! جو گناہ کیا ہے ۔ آسے عوام‌الناس پر بھی ظاہر کر دیتے چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئیے

چونکہ مرزا غالب خود بھی ظریف تھے ۔ خط میں بھی ظریفانہ انداز اختیار کرتے ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود آن کے خطوط میں تاریخی حقائق بھی ملتے ہیں ۔ اور ایسی باتیں بھی ہیں جو غالب کے سوانح نگار کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہیں ۔ اُن مشکلات اور مصائب کی جھلک بھی نظر آ سکتی ہے جن میں غالب نے اپنی زندگی کے اتنے مصائب کے باوجود بھی اپنے آپ کو دکھی ثابت نہیں ہونے دیا ۔ اور اپنے دکھ کو طنز اور مزاح میں مدغم کر دیا ہے ۔ اور جہاں تک میری ناقص عقل کا خیال ہے اگر مرزا غالب کی زندگی میں دکھ نہ ہوتے ، آن کی زندگی کے سہارا نہ ہوتی تو وہ کبھی اتنے بڑے شاعر اور نثر نگار نہ بن سکتے اور کم از کم آن کے کلام میں میر جیسا سوز اور درد نہ ہوتا ۔ انہی مصائب ہی نے تو آن کی شخصیت کو ابھارا ہے ۔ اپنی زندگی میں دکھ اور مصائب کے رد عمل کے طور پر انہوں نے اپنی شخصیت میں لطافت ، ظرافت اور شگفتگی بھر دی جس کی بدولت بڑی سے بڑی تکلیفوں کو بھی ہنس کھیل کر کاٹ دیتے تھے ۔ اور اس خیال کو نہائیت فلسفیانہ طریقہ پر ظاہر کرتے ہیں ۔

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

محمد گلزار احمد
سال دوم

غالب (فارسی سے اردو تک)

فارسی بیں تابہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

ہمارے موجودہ معاشرے میں ایک با کمال شاعر اور با ذوق نقاد سے لے کر اوسط درجے کے تعلیم یافتہ شخص تک ہر ایک غالب کے سحر آلود کلام کا عقیدت مند اور دلدادہ نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ ان کے کلام کا وقتی تقاضوں کے ساتھ ساتھ ہر ایک کی دلی آرزوؤں کا ترجمان ہونا ہے۔ مگر بے نیاز زمانے کے عام دستور کے مطابق انہیں ان کے اپنے دور میں اس قدر و منزلت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا جس کے دراصل وہ مستحق تھے۔ اس موضوع پر بہت سے نقادوں نے بحث و تمحیص کی ہے مگر حالی "یادگار غالب" میں جہاں کئی اور وجوہات کا ذکر کرتے ہیں وہاں سب سے بڑی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس زمانے میں مغل شہنشاہیت قائم تھی اور مغلوں کی مادری زبان فارسی تھی جس وجہ سے ان کے مقربین میں بھی فارسی ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ اور عوام سے بھی کچھ لوگ بغرض خوشامد اور بادل نخواستہ فارسی بولتے تھے مگر پھر بھی اردو ادب کا ذوق عام تھا۔ چونکہ غالب کے آباو اجداد مغلیہ دور میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اور انہیں فارسی زبان سے کافی واسطہ پڑتا تھا، اس لئے فارسی زبان کا استعمال ان کے خاندان میں کافی ہوتا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ غالب کو بچپن ہی سے فارسی زبان سے بے محابا دلچسپی اور شغف تھا

انہوں نے دس سال کی عمر میں پہلی بار جو غزل لکھی وہ فارسی زبان میں ہی لکھی گئی تھی -

شروع ہی سے وہ فارسی زبان کے دلدادہ تھے اور انہوں نے اپنے کلام کا آغاز ہی اسی زبان میں کیا - ان اشعار میں اردو بھی استعمال کرتے مگر برائے نام اس امتزاج کی وجہ سے ان کا کلام پیچیدہ تراکیب ، بعیدالفہم خیالات اور نا مانوس طرز بیان کا حامل ہو گیا - جسے وہ اپنے لئے فخر سمجھتے تھے - عین اسی زمانہ میں مغل شہنشاہیت کا زوال شروع ہو گیا - جس کی وجہ سے فارسی ہندوستان کے طول و عرض میں کم قدری سے دیکھی جانے لگی اور اردو زبان کا عروج شروع ہو گیا اور عوام کی یہ محبوب زبان پھر سے علم و ادب کی زبان بن گئی - یہ وہی زمانہ تھا جب غالب ابتدائی فارسی کلام مشکل پسندی کی حدود سے باہر نکل کر لکھ رہے تھے - مگر ادھر لوگ اردو کو فارسی پر ترجیح دیتے تھے اور ان کے اپنے زمانے کے شعراء سے یہی امیدیں وابستہ تھیں کہ وہ ان کی پسندیدہ زبان میں ہی دلی خیالات کی ترجمانی کریں - ادھر غالب عوام کی امیدوں کے منافی تھے اور ان کی پرواہ کئے بغیر وہ فارسی میں ہی اپنا کلام لکھتے رہے ان کی عمر کے ساتھ ساتھ ان کا مشکل پسندانہ رحجان اور فارسی زبان سے لگاؤ بڑھتا گیا - ان کے اس دور کے اشعار پر اردو شعروں کا اطلاق ذرا مشکل سے ہی ہوتا ہے - جس کی دو وجوہات نظر آتی ہیں -

ایک تو ان کی طبیعت میں اپچ اور جدت تھی دوسرا اس لئے کہ وہ متقدمین کی پیروی کو اپنی انفرادیت کی ہتک سمجھتے تھے اور شاہراہ عام سے ہٹ کر اپنی انفرادیت قائم رکھنا چاہتے تھے - اس جذبے کی تسکین کے لئے انہوں نے بیدل جیسے تکلف پسند شاعر کو اپنا راہنما بنا لیا -

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا اسد اللہ خاں قیامت ہے

ان کے طرز پر وہ ایک الجھے ہوئے انداز میں ایسے اشعار لکھتے رہے جو زبان اور مضمون کے لحاظ سے انوکھے اور پیچیدہ معلوم ہوتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ غالب کا ابتدائی کلام خاصا گورکھ دھندا معلوم ہوتا ہے - مثلاً

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردن صددل پسند آیا

یا

شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

غالب کا اسی قسم کا کلام دیکھ کر میر تقی میر نے کہا تھا کہ ''اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو وہ ایک لاجواب شاعر بن جائیگا ورنہ مہمل بکنے لگے گا'' میر کا یہ قول غالب کے کلام کے بعیدالفہم ہونے کی عین دلیل ہے ۔

اسی دور میں ایک طرف تو غالب اپنے اس پیچیدہ کلام پر بہت نازاں تھے جسے انہوں نے تخیلات کی حسین وادیوں سے گزار کر مشکل اردو فارسی امتزاج کے لبادے میں پیش کیا تھا مگر دوسری طرف لوگوں کی نا سمجھی اور بے قدری پر افسوس ہوتا ۔ پھر بھی اس رنج سے پہلو تہی کرکے کہہ دیتے ۔

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

مگر وہ ایسے اشعار انکساریہ لہجہ میں نہیں کہتے تھے ۔ بلکہ اس وقت کے ان کے ہر شعر میں فخر کا عنصر سایا ہوتا تھا اور لوگوں سے طنزیہ کہتے کہ ''تم جاہل لوگ میرا کلام کیا سمجھ سکتے ہو'' بعض دفعہ بد دل ہونے کے باوجود فخریہ کہہ دیتے ۔

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

ان کے اپنے کلام پر نازاں ہونے کے باوجود ان کے یار لوگ ان سے مطالبہ کرتے رہے کہ وہ ایسے اشعار کہیں جو عام فہم ہوں اور ان سے کوئی اور بھی محظوظ ہو سکے ۔ یہ سن کر غالب عاجز ہو کر کہنے لگے

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخن وران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم بمشکل وگرنہ گویم مشکل

مگر ان کی یہ حالت دیکھ کر اور ان کے ثقیل اور بے کیف کلام سے تنگ آکر لوگوں نے طعنہ زنی سے کام لینا شروع کر دیا اور حکیم آغا جان عیش جیسے ان کے ہم عصر اعتراضات کرنے لگے

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا نہ سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

غالب جب اپنے قدر دان دوستوں اور ہم عصر شعراء سے اپنے کلام کے بارے میں ایسے اعتراضات سنتے تو ان کے احساسات پر چوٹ تو لگتی ، مگر وقتی طور پر اس مایوسی سے چھٹکارا حاصل کر لیتے

نہ ستائش کی تمنا ، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں میرے اشعار میں معنی نہ سہی

اسی طرح کافی عرصہ تک عوام اور غالب کا ایک دوسرے پر اعتراضات کا سلسلہ جاری رہا - مگر آخر زمانہ ایک بہترین استاد ہے جس کے تقاضے غضب کے ہوتے ہیں اور جو بڑے بڑے خود دار اور عزم صمیم رکھنے والے اشخاص کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیتا ہے - عین اسی طرح جب غالب نے زمانے کے کڑے تقاضات پر غور کیا تو اسے بھی اپنا انداز بدلنا پڑا - انہیں اپنی گمراہی کا احساس ہونے لگا ، مولانا فضل حق خیر آبادی ، مفتی صدر الدین آزردہ ، اور شیفتہ جیسے معاصرین کی آرزوئیں رنگ لائیں اور اس طرح بقول حالی مرزاؔ کے حق میں میر تقی میر کی پشین گوئی جو کسی استاد کے وسیلے سے تو نہیں بلکہ اردو کے پرستاروں کی خواہش سے پوری ہو گئی ۔ حالی نے ''یادگار غالب'' میں لکھا ہے کہ ''مرزا اول میں ایسے رستے پر پڑ لئے تھے کہ اگر استقامت طبع اور سلامت ذہن اور بعض صحیح الذوق دوستوں کی روک ٹوک اور نکتہ چینی ہمعصروں کی خردہ گری اور طعن و تعریض سد راہ نہ ہوتی تو وہ شدہ شدہ منزل مقصود سے دور جا پڑتے - - -''

اس کے بعد غالب نے فارسی کو بالکل ترک نہیں کیا تھا - انہوں نے یہ بے اعتنائی ایک شاعر ہونے کی وجہ سے ٹھیک نہ سمجھی بلکہ کبھی کبھی پھر بھی فارسی میں لکھتے رہے - مگر بہت کم - اردو کو تو انہوں نے اپنا آلہ کار بنا لیا - اردو ادب ہمیشہ ہمیشہ قدرت کا ممنون رہے گا - جس نے زمانے کے ہاتھوں غالب کو اس راہ پر لا کھڑا کیا جس پر چل کر وہ اس منزل پر پہنچے جسے ارتقائے فن کی معراج کہنا غلط نہ ہوگا - وہی کلام جسے وہ بے قدری کی نظروں سے دیکھتے اور ادنیٰ سمجھتے تھے - وہی ان کی عزت کو اردو ادب میں ہمیشہ چمکانے کا ضامن ہے - اور اس کے نکات و معانی اور لطافت و خوبی پر صاحب ذوق و نظر ہمیشہ سر دھنیں گے - اردو میں انہوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اسی میں ان کے لئے ایک مخصوص جگہ پیدا ہو گئی ہے - اور ان کا کلام عشق و محبت ، تصوف ، رندی ہجر و وصال ، رشک ، طنز و ظرافت ، بدگمانی و شکایت اور خود داری و انکساری جس موضوع سے متعلق ہو اپنا ایک جداگانہ رنگ اور نرالی دلکشی رکھتا ہے - اور جس انفرادیت کے وہ خواہاں تھے وہ اب بھی قائم ہے

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

غالب کی غزل

''ہندوستان کی مقدس کتابیں دو ہیں ۔ مقدس وید اور دیوان غالب''
(عبدالرحمن بجنوری)

''مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا ۔ غالب ، اردو اور تاج محل''
(رشید احمد صدیقی)

''دیوان غالب کو نئی نسل کی انجیل کہہ سکتے ہیں''
(ڈاکٹر محمد حسن)

''اردو غزل میں غالب جدت ادا کا امام ہے'' ۔
(ڈاکٹر یوسف حسین)

فکر انسان پر تیری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا
(اقبال)

غالب کی بارگاہ میں عقیدت کے کئی پھول نچھاور کئے گئے ہیں ۔ غالب کو اپنی بو قلمون ، شخصیت شاعرانہ عظمت اور انشاء پردازی کی وجہ سے اردو ادب میں جو انفرادیت حاصل ہے اردو کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ۔ اسی لیے آل احمد سرور نے کہا ہے کہ

''اردو میں پہلی بھرپور اور رنگا رنگ شخصیت غالب کی ہے'' ۔

غالب ہماری ادبی تاریخ کا سب سے زیادہ زندہ شاعر ہے ۔ وہ آج بھی ہمارے دل و

دماغ اور ادبی شعور پر حاوی ہے اور ایک لحاظ سے وہ نئی روایت کا خالق اور پیشوا ہے -

اردو غزل کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ میر نے سب سے پہلے اردو غزل کو خیالات کا ایک مخصوص ذخیرہ اور ان کے اظہار کے اسالیب بخشے - آنے والے شعراء نے انہی خیالات کو خوبصورت زبان میں ادا کر دیا - یہ شعراء چند مقررہ اصولوں کی پیروی کرتے رہے اور الفاظ کی تراش خراش وغیرہ پر زیادہ زور دیتے رہے - ان کے ہاں تجربات اور کیفیات کی رنگا رنگی نہیں - لیکن غالب کی رنگا رنگ طبیعت اور پہلو دار شخصیت نے اردو کی تمام روایت کو ان پر مسلط نہیں ہونے دیا بلکہ کلاسیکی روایت کی پیروی چھوڑ کر اپنی شاعری میں اپنی شخصیت اور انفرادیت کے اظہار پر زور دیا - اس اعتبار سے غالب کو اردو کا پہلا رومانی (Romantic) شاعر کہا جا سکتا ہے انہوں نے اپنے کو صرف پرانے مضامین کے بیان پر محدود نہیں رکھا بلکہ نئی اور منفرد بات نئے اور منفرد انداز میں کہنے کی کوشش کی - انہوں نے فکر و احساس کی نادیدہ سر زمینوں کو دریافت کیا اور رنگا رنگ جھلکیاں دکھائیں - غالب کے اس امتیازی نشان کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم قدیم شعراء کا کلام پڑھتے پڑھتے غالب کا کلام پڑھنے لگیں - اس وقت ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی نرالی طرز و فکر و احساس نے تجربات و معانی کی ایک بھرپور دنیا آباد کر رکھی ہے - جو وسیع بھی ہے اور دل چسپ بھی -

حالی نے بجا کہا ہے کہ "جب میر و سودا اور ان کے مقلدین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اکتا جاتا ہے اور اس کے بعد مرزا کا دیوان دیکھتے ہیں تو جس طرح ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت کا مشاہدہ کرتا ہے - اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے"-

عبدالرحمن بجنوری نے محاسن کلام غالب میں اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک جملہ لکھا ہے - "لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں - کون سا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں"-

اسی وسعت اور تنوع کا سبب مرزا کی متنوع زندگی اور گوناگوں تجربات میں ملتا ہے - غالب بے فکری اور مسرت سے لے کر مایوسی اور ناکامی کی ساری منزلیں طے کرنے کے بعد ایک مکمل ترین انسان بن گئے تھے - یہی وجہ ہے کہ ہر طبقے اور ہر مشرب کے انسان کے لیے ان کے دیوان میں دل چسپی کا سامان موجود ہے

اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص

ع میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

کے طلسم میں اسیر ہو جاتا ہے۔

غالب جب شاہراہ غزل پر گامزن ہوئے تو ہزاروں قافلے ادھر سے گزر چکے تھے۔ یہ پامال اور پٹا ہوا راستہ بلند خیال اور ذہین فرد کی قدم زنی کے قابل نہ رہا تھا۔ غزل کی صلاحیتیں اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھیں۔ ان کے معاصر شاہ نصیر نے سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیف قافیے کی طرف توجہ کی۔ ذوق نے زبان اور محاورہ پر زور دیا۔ مومن نے لفظوں کی نشست اور مخصوص طلسم سے اشعار میں تیکھا پن پیدا کیا۔ غالب نے شروع میں مرزا بیدل کے انداز کی پیروی شروع کی۔ چنانچہ ابتدائی کلام میں فارسی الفاظ اور تراکیب کی کثرت سے زبان میں ثقالت آ گئی تھی۔ مضمون بندی اور خیال آفرینی کی دھن میں اکثر ان کی پرواز اتنی اونچی ہوتی تھی کہ عالم محسوسات سے ان کا رشتہ منقطع ہو جاتا تھا۔ معاصرین کی نکتہ چینی نے خوشگوار اثر ڈالا اور انہوں نے نسبتاً آسان زبان استعمال کی۔ اور اپنے تخیل کے بے قابو گھوڑے کو رام کر لیا۔ حالی نے ان کی غزل کی چھ خوبیاں گنوائی ہیں۔

۱- جدت مضامین و طرفگیٔ خیالات۔

۲- نادر تشبیہات۔

۳- استعارے کنایے کا خوبصورت استعال۔

۴- شوخی و ظرافت۔

۵- پہلو دار اشعار۔

۶- سیدھے سادے خیالات میں ندرت پیدا کرنا۔

غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے غزل کو صرف حسن و عشق کے دائرے میں محدود نہ رکھا بلکہ بے پناہ وسعت دی۔ غزل جو اب تک دل کے پھپھولے پھوڑنے یا تفنن طبع کے کام آتی تھی اسے ابدی حقیقتوں کا ترجمان بنایا۔ انہوں نے نہ رسمی تصوف میں پناہ لی اور نہ فرضی عاشق بنے بلکہ انہوں نے زندگی کے مسائل کو سمجھا۔ انہیں زندگی سے دلچسپی تھی اور ان کی ناکامیوں نے انہیں کبھی مایوس نہیں کیا۔ غالب نے اردو شاعری میں سب سے پہلے ایک بے فکرے کھلنڈرے کردار کو نمایاں کیا۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

وہ ہر چیز کو گدگداتے اور چھیڑتے ہوئے نکل جاتے ہیں ۔ ان کے غم میں بھی شگفتگی ملتی ہے ۔ وہ نہ خود کو بخشتے ہیں نہ محبوب کو ، یہاں تک کہ معتقدات بھی زد میں آ جاتے ہیں لیکن لہجے کی درشتی اور گستاخی کہیں نہیں ۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

اور آزادہ روی اس حد تک کہ

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

اس قسم کے اشعار صرف غالب ہی کہہ سکتے تھے ۔

تیرے وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پر بہت سے ستم ہوئے

غم اگرچہ جانگسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہو گئیں

تو اور آرائش خم کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفیٔ منصور نہیں

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

شگفتہ بشیر

غالب کی فارسی شاعری

غالب اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے بلند پایہ شاعر تھے مگر ان کی نظر میں اردو کلام کچھ وقعت نہیں رکھتا تھا ۔ وہ اسے باعث فخر سمجھنے کی بجائے باعث ننگ سمجھتے تھے ۔

پارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

ایک اور جگہ انھوں نے اپنے آپ کو ''عندلیبے از گلستان عجم'' کہا ہے ۔

بود غالب عندلیبے از گلستان عجم
من ز غفلت طوطئ ہندوستان نامیدش

مرزا غالب نے فارسی زبان میں گنجینۂ معنی کا ایک طلسم چھوڑا ہے ۔ فارسی کلیات ایک ایسا خزانہ ہے جس میں طرح طرح رنگ بہ رنگ نو بہ نو پھول کھلے ہیں ۔ انھوں نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے ۔ فارسی میں ۶۶ قطعے ، ایک مخمس ، تین ترکیب بند ، ایک ترجیع بند ، گیارہ مثنویاں ، ساقی نامہ ، ۶۳ قصائد ، ۳۲۱ غزلیات ۱۰۳ رباعیات اور ۵ نوحہ جات یادگار چھوڑے ہیں ۔

انھوں نے اساتذہ فن عرفی ، جامی ، حافظ ، فیضی ، نظیری ، بیدل ، ظہوری وغیرہ سے استفادہ کیا اور فارسی میں کافی دستگاہ پیدا کرلی ۔ مرزا تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

''فارسی میں مبداء فیض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی سے انھیں قدرتی مناسبت تھی جو مشق سے ترقی

باقی گئی -

مرزا کے کلام کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں -

۱ - حزنیت

غالب کو زندگی بھرنا موافق حالات سے دوچار ہونا پڑا جس سے آپ بہت متاثر ہوئے چنانچہ ان کے کلام میں حزنیت ہے - غم کی طرح ہنسی بھی ایک قدرتی جذبےکا نتیجہ ہے غالب اپنے غموں میں بھی کہیں کہیں ہنستے نظر آتے ہیں - لیکن ان کی ہنسی کی نوعیت مختلف ہے ، وہ جب اہل عشرت کی محفلوں کو دیکھتے ہیں تو ایک فلسفی کی طرح ہنستے ہوئے گزر جاتے ہیں کہ میں دنیا کی خوشیوں سے خوب واقف ہوں

از شرر گل در گریبان نشاط افگنده اند
خنده ها بر فرصت عشرت پرستان کرده ام

غالب غم کو روحانی نشو و نما کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں اور غم کی دولت حاصل ہونے پر شکریہ بھی ادا کرتے ہیں - ان کا خیال ہےکہ غم انسانیت کے زنگ کو دور کرتا ہے - غم عقل و شعور سکھانے کا ذریعہ ہے ، غم غفلت کو دور رکھتا ہے - جب ذوق نغمہ کم ہو ، جب تھکان اور رنج راہ کی وجہ سے محمل گراں معلوم ہوتا ہو تو عرفی غم اور نوائے غم کا سہارا لیتے ہیں - مثلاً

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

غالب غممیں جب بھی افسردہ ہوتے ہیں اور انکی تمنا کچھ سرد پڑ جاتی ہے تو اپنے شوق کو پکارتے ہیں کہ آؤ اور میرے خنک سینے کو گرما دو اور آہ کو دعوت دیتے ہیں کہ آؤ اور ہیجان کی آگ سلگاؤ -

غالب غم کو تربیت انسانی کا ایک وسیلہ سمجھتے ہیں - ان کا خیال ہے کہ قدرت جن لوگوں کو ترقی کی منزلیں طے کرانا چاہتی ہے ، انہیں وادی غم سے گذارتی ہے تاکہ وہ نشیب و فراز سے واقف ہوکر کسی ارفع مقام پر پہنچ جائیں -

قضا در کارہا اندازهٔ ہر کس نگہ دارد
بقطع وادیٔ غم می گمارد تیز گاماں را

جذبات نگاری

غالب کے بیشتر اشعار جذبات و احساسات سے بھرپور ہیں - ان میں غالب کی گہری داخلیت نمایاں ہے - یہ اشعار رواں اور سادہ ہیں - اس قسم کی شاعری کو غالبہ

کی وجدانی شاعری کہتے ہیں -

بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم
قضا ز گردش رطل گراں بگردانیم
بگوشہ بہ نشینیم و در فرازکنیم
بکوچہ از سر رہ پاسبان بگردانم

پھر جب آپ جام ہم نشین سے سرشار ہوتے ہیں تو شان بے نیازی میں کہہ اٹھتے ہیں -

اگر ز شحنہ بود گیرودار نندیشیم
وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگر دانیم
اگر کلیم شود ہمزباں سخن نہ کنیم
وگر خلیل شود میہماں بگردانیم

غالب دلی کیفیات کو بیان کرتے ہیں تو ان کا قلم مصور کے موقلم کا کام دیتا ہے ، جذبات کو وہ اس طرح نظم کرتے ہیں کہ ان کی ہو بہو تصویر کھنچ جاتی ہے -

تا در آب افتادہ عکس قد دلجویش
چشمہ ہم چو آئینہ فارغ از روانی ہا

نئی تراکیب -

غالب کو اچھوتے خیالات کے اظہار کے لیے الفاظ و تراکیب وضع کرنے کا خاص ملکہ ہے - اس فن میں ان کی ہستی آج بھی یگانہ ہے ، کہتے ہیں -

گر بمعنی نرسی جلوہ صورت چہ کم است
شکن زلف و سرطرف کلاہی دریاب

غالب تشبیہ و استعارہ اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ مضمون میں بلندی اور انداز بیان میں حسن پیدا ہو جاتا ہے -

رموز تصوف

غالب کے کلام میں صوفی شعراء کی طرح عارفانہ مضامین مسلسل اور مربوط صورت میں نہیں ملتے - البتہ آپ کی غزلیات میں جا بجا بکھرے ہوئے ضرور نظر آتے ہیں وہ خود کہتے ہیں کہ ”آرائش مضمون شعر کے واسطے کچھ تصوف اور کچھ نجوم

لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونیت طبع کے یہاں کیا رکھا ہے۔''

غالب نے بھی بعض اشعار میں نظریہ وحدت الوجود پر روشنی ڈالی ہے، کہتے ہیں۔

غرق در محیط وحدت صرفیم در نظر
از روی بحر، موجہ وگرداب شستہ ایم

سمندر مطلق ایک سمندر کی طرح ہے ۔ اس سمندر میں حباب اٹھتے اور مٹتے چلے جاتے ہیں ۔ ظاہر بین آنکھ کو حبابوں ، لہروں اور بھنوروں کا الگ وجود نظر آتا ہے لیکن دیکھنے والی آنکھ کے نزدیک اصل حقیقت بحر کی ہے ۔ غالب سطح بحر کی موجوں اور گردابوں سے نظر ہٹا کر اصل حقیقت یعنی بحر کے مشاہدے میں غرق ہیں ۔

غنائیت ۔

غالب کی بعض غزلوں میں حروف کی تکرار اور ہم آہنگ حروف کے امتزاج کی وجہ سے نغمے کی سی شان پیدا ہوگئی ہے ۔ مثلاً

ز من بجرم تپیدن کنارہ می کردی
بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر

فلسفیانہ توجیہات

استدلال اور فلسفیانہ توجیہات بھی سبک ہندی کا خاصہ ہیں جو ہمیں غالب کی کلیات کے صفحے صفحے پر نظر آتی ہیں ۔ آپ مسائل زندگی کچھ ایسے استدلال سے پیش کرتے ہیں کہ فلسفیانہ بحث شعر کے سانچے میں ڈھل کر مؤثر ہو جاتی ہے ۔ ایک فلسفیانہ نکتہ ہے کہ کوئی تکلیف ہو تو اس کا احساس ضرور ہوتا ہے لیکن جب کسی بڑے حادثے کا سامنا ہو تو پہلی تکلیف بھول جاتی ہے ۔ غالب کہتے ہیں ۔

تو نالی از خلش خار تنگری کہ سپہر
سر حسین ابن علی برسنان بگرداند

یعنی تمہیں کانٹا بھی چبھتا ہے تو تم فریاد و فغاں کرنے لگتے ہو ، دیکھتے نہیں کہ یہ فلک کج رفتار حسین ابن علی کے سر مطہر کو بھی نیزے پر بلند کر دیتا ہے ۔

قصہ مختصر غالب کا فارسی کلام بھی ان کے اردو کلام کی طرح جامع کمالات ہے ، لیکن اپنی فارسی پر انھیں خاص طور پر فخر ہے ۔

فارسی بین تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعہ اردو کہ بیرنگ من است

غلام شبیر سیال

دیوان غالب کا پہلا شعر

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

یہ شعر دیوان غالب کا پہلا شعر ہے اور اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ شارحین نے اس کا مفہوم متعین کرنے میں اختلاف سے کام لیا ہے۔

عام رواج یہ تھا کہ دیوان کی ابتدا حمد سے یا منقبت سے کی جاتی تھی غالب نے بھی اگرچہ ابتدا حمد سے کی ہے مگر اپنی شوخیٔ طبع کا ثبوت دیتے ہوئے خدا سے گلہ کیا ہے۔ گویا یہ شعر خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لینے کا مترادف ہے۔

خود غالب نے اپنے ایک خط میں اس شعر کی تشریح یوں کی ہے۔

''ایران میں یہ رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے جیسے مشعل دن کو جلانا یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا، بس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے اس کا پیرہن کاغذی ہے یعنی ہستی اگرچہ مثل اعتبار محض ہو موجب رنج و ملال و آزار ہے''

شارحین میں سے نظم طباطبائی نے اس شعر کو مہمل قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ کاغذی پیرہن پہننے کا رواج نہ کہیں دیکھا نہ سنا۔ حالانکہ اس بیان کی تردید میں کمال اسماعیل کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے

کاغذی جامہ بپوشید او بدرگہ آمد
زادۂ خاطر من تابدہی داد مرا

سعید نے وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے ''حاصل شعر کا یہ ہے کہ ہستی خواہ کسی

چیز کی بھی ہو باعث تکلیف و رنج ہے حتیٰ کہ تصویر تک بھی جو کہ صرف ایک ہستی محض ہے بزبان حال دریافت کر رہی ہے کہ مجھ کو ہست کر کے کیوں رنج ہستی میں مبتلا کیا جب کہ کاغذی پیرہن سے ظاہر ہے -

سہا نے یوں تشریح کی ہے

"گویا اصل جدا ہونے کے بعد اضطراری کیفیت پیدا ہو جانا ضروری ہے اس طرح جب تصویر کاغذ پر بنائی جاتی ہے تو وہ اپنے کاغذی لباس کی بدولت نقاش کی شوخئی تخلیق کی زبان حال سے فریاد کرنے لگتی ہے -"

بے خود لکھتے ہیں کہ ہر پیکر تصویر سے مراد جملہ حیوانات ، جمادات اور نباتات سے ہے - یہ ساری چیزیں فنا ہونے والی ہیں جب موجودات عالم کا یہ حال تو نقش ہستی کا اپنی بے ثباتی پر فریادی ہونا شاعر کے تخیل بلند اور غیر معمولی جدت کا ثبوت کامل ہے -

یوسف سلیم چشتی نے تحریر کیا ہے کہ غالب کا یہ شعر جو در مطلع دیوان ہے ان کی شوخئی فکر کا بلا شک و شبہ آئینہ دار ہے - انہوں نے حمد کے پردے میں خدا سے گلہ کیا ہے کہ اے خدا کہ جب تو نے ہر مخلوق کو فنا کے لئے پیدا کیا تو پیدائش میں اس قدر کمال کا اظہار کیوں کیا ، با لفاظ دیگر جب ہست کر کے مٹانا منظور تھا تو ہست کرنا ہی کیا ضرور تھا -

اثر لکھنوی نے یوں وضاحت کی ہے کہ معلوم یہ ہوا کہ ہر شے زبان حال سے فریاد کر رہی ہے کہ اے ہمارے پیدا کرنے والے ! اے حضور بے بدل ! تو نے ہماری تخلیق و تشکیل میں کیا کیا صفتیں و حکمتیں صرف کیں لیکن کیا عنایت ہے کہ جو ہے دست برد فنا میں ہے - نہ قرار ہے نہ ثبات ہے - اگر مٹانا تھا تو بنانے میں اتنا اہتمام اتنا تکلف کیوں کیا !

نیاز فتحپوری نے اس کا مفہوم یہ لکھا ہے کہ اس نگار خانہ عالم کی ہر ہر چیز نقاش ازل یعنی قدرت کے حضور میں زبان حال سے اپنی نا استواری و فنا پذیری کی فریاد کر رہی ہے -

احسن علی خاں نے اسے نیا مفہوم بخشا ہے - اس شعر کا محرک وہ جذبۂ تحسین و قدر دانی ہے جو مغلیہ دور کی مصوری کے شاہکار دیکھ کر ابھرا - جاندار اشیا کی تصاویر بالکل ہو بہو جیتی جاگتی تھیں لیکن وہ افعال نہیں کر سکتی تھیں جیسا کہ اصل حالت میں ممکن ہوتا - ان کا لباس کاغذی تھا - غالب کے ذہن میں ایران کی وہ رسم کہ مظلوم اپنی مظلومیت کا اظہار زبان سے نہیں بلکہ کاغذی لباس پہن کر کرتے تھے موجود تھی

تصویر کے دیکھتے ہی ذہن میں پہلے دوسرا مصرع آیا اور بے ساختہ منہ سے نکل گیا

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

تصویر اگر کسی چیز کی شکایت کر سکتی تھی تو وہ مصور کی اس مہارت فنی کی کہ زندہ مخلوق کے بالکل مطابق بنائے ہوئے وہ اس کو زندگی کی روح نہ دے سکا چنانچہ مصرع ثانی کے لئے مواد مل گیا اور اس طرح شعر موزوں کر دیا گیا ۔

وجاہت علی سندیلوی لکھتے ہیں کہ غالب نے لفظ نقش سے پورا نگار خانہ عالم مراد لیا ہے ۔ نقش کی رعایت سے تحریر کیا ہے جو تخلیق کے معنی ادا کرتا ہے گویا یہ ساری کائنات خدا کی تحریر ہے ۔ کاغذی پیرہن سے نہ صرف مبتلائے غم ہونا بلکہ بے ثبات ہونا واضح ہو جاتا ہے ۔ اس طرح ایک لفظ تصویر سے تخلیق کا حسن اور کمال ظاہر کر دیا ہے ۔

خلیفہ عبدالحکیم یوں وضاحت کرتے ہیں کہ خالق کائنات نے اس پردۂ عدم پر وجود کے نقش بنائے جن کی بو قلمونی اہل نظر کے لئے حیرت انگیز ہے۔مصور حقیقی زندگی کا ترجمان ہے اور زندگی سراپا تغیر ہے کوئی چیز جمادات ، نباتات ، حیوانات۔ انسان ایک لمحہ بھی اپنی حالت پر قائم نہیں رہتی ۔ انسان اس لا متناہی انقلاب میں ثبات ڈھونڈتا ہے لیکن ثبات کہاں ؟

آسان الفاظ میں اس کا مفہوم یوں ادا کر سکتے ہیں کہ غالب نے حمد کے پردے میں خدا سے گلہ کیا ہے کہ جب ہر مخلوق کو فنا کے لئے پیدا کیا تو ہست کرنا ہی کیا ضرور تھا ۔ گویا ہستی خواہ وہ غیر حقیقی ہی کیوں نہ ہو موجب آزار ہے ۔ اسی لئے ہر شے فریادی ہے کہ مجھے پیدا کر کے عذاب میں ڈال دیا گیا ہے لہذا جب تک زندہ ہے اپنی ہستی کے ہاتھوں نالاں ہے ۔

امید ہے شعر کا مفہوم واضح ہو گیا ہوگا اور اگر تشریح نہیں ہوئی تو غالب کا یہ مصرع پڑھنا بہتر ہوگا

خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

(غالب کے نام خط غالب کے انداز میں)

غالب کے نام خط

(غالب کے نام خط (چار سو الفاظ) لکھنے کا مقابلہ منعقد ہوا جس میں متعدد طلباء اور طالبات نے حصہ لیا ۔ ذیل میں منتخب خطوط دیے جا رہے ہیں ۔)

۱

کچھ سنا آپ نے ! چچا لوگ کیا کہتے ہیں ۔ آپ کو خط لکھیں ۔ کیونکر لکھیں ؟ کیا لکھیں ؟ اور اگر لکھیں تو جواب کیونکر پاویں ؟ کیسی بستی میں جا بسے آپ ! ہرکارہ وہاں نہ جائے ، کوئی لوٹ کر وہاں سے نہ آئے ۔ حیران ہوں کہ کوئی خیریت کی خبر پاوے تو کیونکر پاوے ۔

کہیے کیسی ہے آپ کی جنت ؟ اس پری چہرہ کی زیارت ہوئی جو بڑی رعونت سے کہتی تھی کہ ''ہم حور ہیں''

خوب مزے ہوں گے ۔ عارف ، میر ، مہدی ، علائی ، مولائی سب ہی تو ملے ہوں گے ۔ حالی ، میر ، سودا ، درد کے ساتھ روز روز محفل شعر و سخن منعقد ہوتی ہو گی ۔ ہنسی مذاق قصیدے ، ہجویں ، حور و غلمان سے چہلیں ۔ کباب ، شراب کیا کچھ نہ ہوتا ہو گا ۔ آپ تو خوب سیر ہو کر پیتے ہوں گے ۔ ہےہے ! خدا نہ کرے کہ وہاں بھی قرض کی پینی پڑے ۔

واللہ چچا ! کبھی کبھی گھڑی پل کو دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں تو دیکھیں کیا ڈنکا بج رہا ہے ، آپ کے نام کا ۔ آپ کی زندگی کا کون سا پہلو ہے جس پر علیحدہ کتاب نہیں لکھی گئی ۔ کون سا مکتب ہے جہاں آپ کی غزلیں نصاب میں شامل نہیں کی گئیں ۔ لائبریریاں بھری ہیں آپ کی کتابوں سے ۔ اردو غزل کے شہنشاہ گنے جاتے ہیں آپ ! میر بھی آگے ماند دکھائی دیتے ہیں اور آپ کے مکاتیب نے جو شہرت پائی ہے کیا پائی ہو گی کسی نے ۔ آپ پر مضمون لکھنے پر انعام پائے جا رہے ہیں بقول شاعر :

چمن میں آ کے ذرا اپنا ذکر خیر تو سن
کلی کلی کی زباں پر ہے بندگی تیری

کبھی آپ چند لمحوں کے لیے عالم ارواح سے عالم اثبات میں تشریف لاویں تو بے مہری' یاران وطن کا شکوہ جاتا رہے -

اردو غزل بے چاری اتنے ناز برداروں اور قدردانوں کے باوجود بھی آپ کے بغیر زار زار رو رہی ہے -

لکھنے کو تو دفتر سیاہ کر دوں مگر اللہ رے بے بسی اور دنیا والوں کی ستم ظریفی کہ بھتیجی کو کہیں کہ چچا کو خط لکھ مگر چار سو الفاظ سے زائد نہ لکھ -

اب آپ کو خدا کے سپرد کروں تو کیونکر کروں کہ خدا کے سپرد تو آپ ہو چکے لہذا رخصت چاہتی ہوں -

نیاز مند
آپ کی بھتیجی
عارفہ انجم

جامعہ نصرت ربوہ

(۲)

کس کو خط لکھا جا رہا ہے ؟

"مرزا غالب کو"

"مرزا غالب کو ؟ کیونکر ؟

"بھئی سیال صاحب نے وعدہ فرمایا ہے خط پہنچانے کا اور تم جانتے ہو ہم ٹھہرے مرزا صاحب کے پرستار"

سنائیے کیسے گزر رہی ہے اور آپ کہاں مقیم ہیں جنت میں یا - - - اور ہاں یہ تو کہیے کہ آیا واقعی جنت کا وجود بھی ہے یا جی بہلانے والی بات ہے اور اگر حقیقتاً یہ موجود ہے تو کہیں آپ فرشتوں کے لکھے پر پکڑے تو نہیں گئے ناحق - کیونکہ ظاہر ہے کہ آپ کو ولی بنانے میں جو چیز حائل رہی وہ جنت میں پہنچانے میں بھی مانع آ سکتی ہے - مگر یہ بھی تو ہے کہ آپ کو تو شغل اک گونہ بے خودی درکار تھی اور جس کی بے غرضی کا یہ عالم ہو کہ بہشت کو دوزخ میں ڈال سکتا ہو اور ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد طلب کر سکتا ہو تو لازماً اسے صلہ ضرور ملا ہوگا -

اور کہیں سے کیونکر ملتی ہے ؟ قرض کی تو نہیں پینا پڑتی اب ! اور قاضی کی شراب طہور کا کیا بنا ؟ اب تو پیتے پلاتے ہیں نا -

یہاں کی حالت کیا عرض کریں - جو اجتہاد آپ شاعری میں کر گئے اس کی مزید آرائش ایک ایسی ہستی نے کی جو آج آپ کے پاس ہے - میرا مطلب علامہ اقبال سے ہے اللہ اللہ تنگنائے میں انہوں نے وہ جولانیاں دکھائیں کہ قطرہ میں دجلہ نظر آیا ہے اور جزو میں کل - آہ وہ شمع بھی نہ رہی - یہاں کی رونق موتوف تھی جن ہستیوں پر ایک ایک کر کے رخصت ہوئیں وہ احباب ، وہ محفلیں نہ جانے کیا ہوئیں - آج کل ان محفلوں کو زندہ کرنے کا طریقہ ریڈیو والوں نے ریڈیائی مشاعروں کی صورت میں کیا ہے مگر اس میں وہ بات کہاں - فردوس گوش تو کبھی کبھی بن ہی مگر جنت نگاہ بننا ان کے مقدر میں نہیں -

اب رخصت چاہوں گی - میرے تمام احباب سلام عرض کرتے ہیں -

نیاز مند
سلمیٰ شریف
اسلامیہ کالج ، فار ومن لائل پور

۳

کوئی ہے ذرا مرزا نوشہ کو بلوائیو - لو صاحب وہ آئے - سترے بہترے بوڑھے اپاہج آدمی - اتنے روز کہاں رہے - سو برس سے راہ تکتی ہوں - ہم سے جدا کیا ہوئے ملنا بھی چھوڑا - یہاں میری تقصیر معف کرو - تمھاری جان اور اپنے ایمان کی قسم جب سے ملک عدم کو گئے ہو دھیان تم میں ہی لگا رہتا ہے - خدا نہ کرے کہیں ہجوم شوق میں قوت متفکرہ میں کوئی فرق نہ آ جائے- اے بندۂ علی - اب نہ تمہیں روٹی کی فکر ، نہ پانی کی پیاس ، نہ جاڑے کی شدت ، نہ گرمی کی شدت ، نہ حاکم کا خوف ، نہ مخبری کا خطرہ ، نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے ، نہ گوشت گھی منگواؤ ، نہ روٹی پکواؤ ، کاس ٹیلن اور اولڈ ٹام کی بجائے شراب طہور کے جام پہ جام اڑاؤ ، عالم نور اور سراسر سرور میں غوطے کھاؤ -

واہ میاں - عجب اتفاق ہے نہ میں تمھارے دیکھنے کو آؤں نہ تم میرے دیکھنے کو قدم رنجہ فرماؤ ورنہ تمہیں دلی لیے چلتی - لکھنؤ کی ویرانی اور دلی کے فساد کا قصہ تو روز روز کی بات ہے - اے درویش گوشہ نشین ! تم بھی کیسی صاحبزادوں کی سی باتیں کرتے ہو - کہاں وہ دلی اور کہاں بہ دلی آپا ہاہا -

بھارت ماتا کی راج دھانی ہے - اندرا رانی کا دربار سجتا ہے -

بہت دن ہوئے گوبند سہائے کا عنایت نامہ پہنچا تھا - حال معلوم ہوا منشی ہرگوپال تفتہ بڑی مصیبت سے دو چار ہوا — اردوئے معلیٰ کی دکانیں ڈھے جا رہی ہیں - غلہ گراں ہے - میوہ ماش دال ترکاری کا تو عالم ہی جدا ہے -

ارے صاحب تمہیں بھلا کب یاد ہو گا۔ جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو اپنے پیچھے ایک دیوان چھوڑ گئے تھے اس میں یہ شعر ہے۔

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

یہاں ! کچھ خبر بھی لو گے یا یونہی پڑے رہو گے جیسے اپنی خبر ہی نہ ہو۔ لو سنو ! تمہارا یہ دعویٰ مسائل تصوف کے بیان کی وجہ سے نہیں بلکہ اخلاق و عادات کی وجہ سے اس دنیائے فانی میں قبول کر لیا گیا ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ خاطر جمع رکھو اور مرزا کی مدح کے قصیدے سنو۔ گونٹے اور غالب دونوں اقلیم سخن کے شہنشاہ ہیں۔ دروغ گو نہیں ہوں۔ خوشامد میری خو نہیں۔ ستم پیشہ ڈومنی سے تمہارے عشق کا چرچا اب بھی ہے۔ ہائے ہائے کی دھوم مچی ہے۔ غمگساری کا یہ عالم ہے کہ تمہارے علم و فضل سے متاثر ایک پرستار کا کہنا ہے کہ مرزا غالب کی محبوبہ ایک فرضی عورت ہے۔ ان کا عشق ہوس اور لذات سفلیہ سے پاک ہے۔ سبحان اللہ

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

کیا فرماتے ہیں حضرت غالب ''چنا جان نہ سہی منا جان سہی'' کاغذ باقی نہیں۔ اب قطع کلام کرتی ہوں اور امید قوی رکھتی ہوں کہ عنقریب لکھیے گا۔ غالب برا نہ مانیے۔ خط بیرنگ نہ ہو

ملاقات کی منتظر
بشریٰ عنبر
(ربوہ)

۲

میاں غالب
خوش رہو۔

سوچا آج غالب کو ہی یاد کروں۔ کاغذ و قلم اٹھایا۔ خط لکھنا شروع کیا مگر یہ کیا پتا نا معلوم۔ نامہ بر لا پتا۔

ہاں سچ کہیو۔ آج کل کہاں قیام ہے۔ فردوس بریں میں یا کہیں اور۔ اگر فردوس میں قیام ہوگا تو میاں خوب وارے نیارے ہوں گے۔ دودھ کی بہتی نہریں اور حسین چہرے ہوں گے۔ کہیں سیاہ بختی نے دوسری جانب دھکا دے دیا تو خدا ہی حافظ ہے۔ صاحب کیوں بار بار شرمندہ کرتے ہو کہہ تو دیا کچھ مشکل نہیں۔ نہ

غزل کبھی نہ مضمون لکھا یہ تو ایک دل لگی ہے ۔ ورنہ میں کہاں اور یہ خامہ فرسائی کہاں ۔ ہر وقت دوست احباب کا تانتا بندھا رہتا ہے ۔ اتنا وقت کہاں کہ کچھ لکھوں ۔ جہاں لکھنا شروع کیا ۔ کوئی نہ کوئی آ موجود ہوا ۔ سکون کا فقدان ، تنہائی کا خاتمہ ۔ ایسے میں کوئی لکھے تو کیا خاک لکھے ۔ آپ ہیں کہ برابر لکھنے پر زور دے رہے ہیں ۔

میاں ! یونیورسٹی کا وہی حال ہے ۔ وہی پرانا روگ ۔ وہی ڈیبیٹ لیکن مجھے کیا ۔ میں ان دھندوں میں کیوں پھنسوں ۔ امتحان سر پہ آگیا ہے ۔ کتابیں جوں کی توں پڑی ہیں ۔ اب پوچھو گے سارا سال کیا کیا ۔ لکھ تو دیا ۔ بس شرافت کا دم بھرتے رہے ۔

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

میاں ! کیا پوچھتے ہو اس دار فانی کا حال ۔ وہی چرخ پیر کی ستم ظریفیاں ہیں ۔ سیاسی ہے چینیاں ہیں ۔ مجبوں کا حال کیا کہوں لکھتے شرم آتی ہے ۔ دوست احباب ایک ایک کرکے ساتھ چھوڑتے جا رہے ہیں کوئی پرسان حال نہیں ۔ شعرا اور علما کا فقدان ہے ۔ ادبی میدان صاف ہے ۔ نہ وہ ذوق نہ وہ رنگا رنگ بزم آرائیاں ۔ سوچا ایک غزل لکھ کر برائے اصلاح ارسال کروں مگر میاں تم خود اپنی مصیبت میں گرفتار ہوگے ۔

برخور دار محمود آیا تھا تمہارا حال پوچھتا تھا ۔ میں نے کہا مجھے کیا معلوم داروغہ بہشت سے دریافت کرو ۔ سلام کہتا تھا ۔

نسیم نقوی
حیدر آباد یونیورسٹی

(۵)

چچا غالب !

فرمائیے زندگی کیسی گزر رہی ہے ۔ سردی خوب پڑ رہی ہے ۔ آپ یقیناً فرغل پہنے اور لحاف اوڑھے اور حقے کی نے منہ میں لیے مزے سے بیٹھے ہوں گے ۔ اور کوئی نیا خیال ذہن میں گردش کر رہا ہوگا ۔ سنائیے آپ کی دلی کا کیا حال ہے ! کیا خوب مسلمان تو دلی سے نکالے گئے اور آپ ہیں کہ جمے بیٹھے ہیں ۔

بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

سنتے ہیں آپ کی دلی بہت خوب صورت ہے ۔ جبھی تو آپ وہیں کے ہو کر رہ گئے ہیں ۔ ویسے ان حالات میں کہ دلی شہر ، شہر خموشاں ہے ۔ آپ وہاں کیسے جی سکتے ہیں ۔ آپ کی طبیعت کو ہرگز گوارا نہیں مگر اس کے بغیر چارہ نہیں ۔ خاص طور پر اس موسم میں کہ خون برف کی طرح جمے جاتا ہے ۔ ویسے عرض ہے

کہ اگر آپ کو دلی چھوڑنا پڑے تو بے تکلف لاہور چلے آئیے - سیاسی نقطہ نظر سے بھی آپ کا وہاں رہنا مناسب نہیں ہے -

اب میرا قصہ سنیے - پنجاب کے ایک شہر لائل پور جو کہ لاہور سے نوے میل ادھر جنوب میں واقع ہے میں سال دوم کا طالب علم ہوں - ادب سے بھی کچھ ذوق رکھتا ہوں - اس وقت ایک غزل ارسال خدمت ہے - مطلع ملاحظہ ہو

روح تقدیر لکھی جاتی ہے جن کے ہاتھوں
ان کی تقدیر لکھونگا میں خود اپنے ہاتھوں

واہ صاحب کیا اچھوتا خیال باندھا ہے - صاحبزادے تم نے تو کمال کر دیا" آپ یہی کہیں گے نا - اجی حضرت آپ نے خود ہی داد دے دی - ورنہ میں زبردستی وصول کر لیتا - پھر بھی آپ تو غزل کے استاد ٹھہرے - اصلاح کرکے بھیج دیجیے گا - یہ کہہ کر پیچھا چھڑانے کی کوشش نہ کیجیے گا -

ضعف نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اور چچا جان یہ آمد اور آورد کا کیا چکر ہے - مولانا حالی تو آورد کے قائل ہیں اور آمد کو بے بنیاد قرار دیتے ہیں - میں خود شعر کہنے لگا تھا تو سر میں کھجلی شروع ہو گئی تھی - آپ ہی بتائیے کہ اس آمد میں کتنی صداقت ہے !

ایک بات میری فکر سے بالا تر ہے - کہ غالب سا خود دار شاعر بادشاہوں اور فرنگیوں کے قصائد لکھے - یہ کیسے ممکن ہے - آپ نے خود ہی تو فرمایا ہے -

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

پھر یہ قصیدے لکھنا چہ معنی دارد - گستاخی معاف - شاید میں آپ کی مجبوریوں کا صحیح احاطہ نہیں کر سکا - اور ویسے یہ بات بھی صحیح ہے کہ

بے طوق و سلاسل بھی ہے انسان گرفتار

ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ ایک جگہ آپ نے فرمایا ہے

بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا

معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس بات پر تلے بیٹھے ہیں کہ دنیا میں ہر کام کو مشکل بنا کے چھوڑیں گے - خواہ وہ پہلے آسان ہی کیوں نہ ہو - لیکن آپ ایسے عام آدمی کے لیے نا ممکن بنا دیتے ہیں - تو حضرت مانا کہ آپ آسان کام کرنا اپنی توہین یا بے عزتی سمجھتے ہیں - لیکن اپنے اس احساس کمتری کو تمام لوگوں پر تو مسلط نہ کیجیے گا - غالباً آپ کی اسی مشکل پسندی کی وجہ سے آپ کے اشعار بھی بہت زیادہ

مشکل ہیں اور ہر ذوق کا آدمی سمجھ نہیں پاتا - ویسے آپ کی جرأت و جسارت کی داد دینی چاہیے کہ خدا سے بھی دل لگی سے باز نہیں آتے - اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ دوزخ میں پیشگی جگہ مخصوص کروا چکے ہیں -

اچھا تو اب اپنے مطلب کی بات کرتا ہوں - ہم لاہور میں ایک مشاعرہ کر رہے ہیں - غزل کا طرح مصرعہ ہے

نہ ہوئی پوری تمنائے وصال

ویسے آپ لاہور نہ آئیے گا آپ کی مرضی - لیکن ہمارے مشاعرے پر ضرور تشریف لائیے گا تاکہ پنجاب کی سرزمین بھی غالب کی قدم بوسی کی آرزو پوری کر سکے - اب میں آخر میں آپ کو سلام عرض کرتا ہوں ، اور نگارش کو تمام کرتا ہوں -

نیاز مند
فاروق احمد فاروق
میونسپل ڈگری کالج ، لائل پور

(۶)

خط بنام غالب
محبوبہ کی طرف سے

پیارے ! میری زندگی کے سہارے کہو اب تو خوش ہو - کر چکے مجھے رسوا ، ہو گیا ارمان پورا - میں تو پہلے ہی دن تم پر نثار ہو گئی مگر اب ذلیل و خوار ہو گئی - نجانے وہ کیسی گھڑی تھی جو اس انتظار میں کھڑی تھی کہ میرا دل تم پر آئے اور یہ ناچیز رسوا ہو جائے - میں نے تمہارے خطوط کو محفوظ رکھا مگر تم نے آداب الفت کو بھی نہ ملحوظ رکھا - میرے خطوط اغیار کو دکھائے اور میری ایک دن کی بے رخی کا بدلہ لیا ہائے - تم نے یہ ہرگز اچھا نہیں کیا - مگر تمہارے بغیر عجب کیفیت ہے جدائی کا غم ہے ، چشم پر نم ہے دل معشوق کو چین کم ہے - مگر تم ہو کہ مانتے ہی نہیں - شاید درد جانکہ کو جانتے ہی نہیں - کاش تمھیں کوئی احساس ہوتا اور میری عزت کا پاس ہوتا - سوچ رہی ہوں کہ تم سے پیار کیوں کیا تھا ، اپنی محنت کا اظہار کیوں کیا تھا - جب تم نے پہلی بار مجھے خط لکھا تھا کہ

تو سلامت رہے ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

تو میں مسرت سے بے اختیار ہو گئی تھی میرے لیے خزاں میں بھی بہار ہو گئی -

سمجھنے لگی کہ تم کو واقعی مجھ سے دلی محبت ہے مگر اب پتہ چلا کہ مجھ سے نفرت ہے - تم نے دوسرے خط میں لکھا کہ پھر اک بار ملنے کی حسرت ہے میں تمھارا نامۂ محبت پڑھ کر بہت لجائی ، شرمائی ، جب بھی خیال آیا لبوں پہ مسکراہٹ آئی میں نے جواب دیا اور شتاب دیا ـ دونوں طرف سے محبت بھرے خطوط کا سلسلہ شروع ہو گیا ـ میں مسلسل خط کا جواب دیتی رہی اور شاید میرا یہی غلط قدم مجھے ڈبو گیا ـ

مجھے اب بھی یاد ہے جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی ، نہ ہی لب ہلے تھے اور نہ کوئی بات ہوئی تھی ، وہ رات میرے جاگتے بسر ہو گئی یونہی سحر ہوگئی ـ دونوں طرف سے اظہار محبت ہوا میں سمجھی کہ میرا ہم سفر مجھے مل گیا مگر میرا یہ قیاس غلط تھا ـ پیار تو کسی اور سے کرتے رہے اور یونہی جھوٹا مجھ پر مرتے رہے ـ مجھ سے جھوٹے وعدے کیے بیوفا تم نے مجھے کتنے دھوکے دے مگر میں انہیں واہمہ سمجھ کر ٹالتی رہی اور اب بھی یہی سمجھ کر آخری بار احوال دل لکھ رہی ہوں ـ نجانے کتنی بار تم نے یہ شعر اپنے خطوط میں لکھا

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

تم تو کہا کرتے تھے تمھارے بغیر چاہ بے آب ہے ، ابر بے باراں ہے ، دل بے تاب ہے یہ مگر اب اتنے عرصے سے تم نےکوئی خط نہیں بھیجا - میں یہاں تڑپ رہی ہوں دل بے قرار ہو رہا ہے اور زار زار رو رہا ہے ـ میں تو تم سے صرف چند دن کے لیے روٹھی تھی اور تمھارے دوسرے ہی خط پر مان گئی تھی مگر تم ہو کہ اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہو ـ میں نہ لکھتی تو مجھ پہ بے وفائی کا الزام دیتے نجانے کیا کیا نام دیتے مگر اب اپنے اس روئیے پر غور کرو اور اطلاع فی الفور کرو کہ وجہ ناراضی کیا ہے ورنہ تمھارے بغیر میری زندگی کیا ہے ـ خدا کے لیے مان جائیے اور ایک بار غریب خانے تشریف ضرور لائیے ـ رہا گلے شکوے کا معاملہ تو میں انہیں سلجھا دوں گی اور تمہیں منا لوں گی اور ہاں تمھارے نہ آنے کی صورت میں اپنے اس خط کو ''کارواں'' میں چھپوا دوں گی ـ

تمھاری اپنی ـ ـ ـ
تحریر محمد منیر حسین شاہ جوہر
گورنمنٹ کالج جھنگ

(۷)

حضرت پیر و مرشد

مدت سے جی چاہ رہا تھا کہ مخاطبت کی سعادت حاصل کروں ـ علائق

دنیا کی گوناگوں الجھنیں مانع رہیں - معافی کا خواستگار ہوں -

آج قلم برداشتہ حاضر ہو رہا ہوں - فرمائیے مزاج کیسے ہیں - دھلی کی یاد اب بھی باعث اضطراب قلب ہوگی - بلی ماروں کے در و دیوار کا نقشہ تصور سے محو نہیں ہوا ہوگا - یاران سخن داں اب بھی یاد آتے ہوں گے -

حضرت آپ کی جدائی میں ہم وفاداران ازلی پر جو بیتی سو بیتی - اہل قلم نے بیچاری شاعری کا حلیہ بگاڑ رکھا ہے - کہاں آپ کے وقت کی سحر طرازیاں ، استعارہ اور معانی کی سحر آفرینیاں کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زباں اور کہاں یہ حال کہ شعر خالی از معانی ، ہرزہ گوئی کی نشانی ، ایک نئی صنف ایجاد ہوئی ہے - واللہ آپ سن پائیں تو انگشت بدنداں ہو کر رہ جائیں - شعر وزن سے آزاد ردیف قافیہ سے بے نیاز ، معنی شعر در بطن شاعر - ایک مصرع دو چار الفاظ کا تو دوسرا شیطان کی آنت اور اہل سخن ہیں کہ پھولے نہیں سماتے اس ایجاد بندہ پر -

حضرت ! آپ نے دھلی کا سہاگ لٹتے دیکھا - ہم نے ہند کے ٹکڑے ہوتے دیکھے ایک حصہ کا نام بھارت اور دوسرے کا نام پاکستان قرار پایا -

جو خدا دکھائے سو نا چار دیکھنا

حضرت ! مشاعرے تو اب بھی منعقد کیے جاتے ہیں مگر یہ ہلڑ بازیاں ہیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا - اس دور میں شاعر کے لیے خوش گلو ہونا تو گویا کامیابی کی سند ہے -

پیر و مرشد - انگریز ملک سے چلا گیا — دنیا ہی بدل گئی - پہلے وقتوں کی سواریاں غائب - گویا تھیں ہی نہیں - نئی گاڑیاں بلا کی تیز رفتار جہاز اس سرعت سے اڑتے ہیں کہ آنکھ جھپکنے میں یہ جا وہ جا - قبلہ وہ انسان جو کبھی ضعیف البنیان کہلاتا تھا اب چاند ستاروں پر کمندیں پھینک رہا ہے

کچھ عجب رنگ ہیں زمانے کے

آپ کی سمع فراشی کے لیے معافی کا خواستگار ہوں -

دعا کا طالب
بندۂ حقیر پر تقصیر
عارفہ قریشی گورنمنٹ کالج برائے خواتین
سیالکوٹ

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے

''غالب میری نظر میں'' کے عنوان پر ایک مقابلہ منعقد کرایا گیا جس میں پاکستان بھر کے کالجوں کے طلباء اور طالبات نے حصہ لیا۔ شرط یہ تھی کہ تحریر ۵۰۰ الفاظ سے زائد نہ ہو۔ منتخب تحریریں پیش خدمت ہیں۔

(۱)

بخدا جب کبھی تذکرہ کلام غالب ہوتا ہے تو میری جو کیفیت ہوتی ہے کے کو تو خود غالب ہی زیادہ بہتر طور پر بیان کر سکتے ہیں۔

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

آخر غالب نے دلوں پر یہ حکمرانی کیوں کر قائم کی۔ اس کا جواب اگر مختصراً دیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ غالب نے ''دنیائے دل'' میں قدم رکھا بدست جام غزل اور اس کے ہر باسی کو فکر امروز و فردا سے بے نیاز کردیا۔ غالب بنیادی طور پر فارسی‌گو تھے اور اپنی فارسی کو ''نقش ہائے رنگ رنگ'' نیز اردو کو ''بے رنگ'' تصور کرتے تھے مگر ریختہ کہنے کو ''جز انبساط خاطر حضرت'' سے زیادہ نہیں سمجھتے تھے اور جو کچھ کہتے بھی تھے تو وہ فارسی عربی تشبیہات و استعارات سے پر فارسی موسوم بنام ریختہ ہی ہوتا تھا۔ لیکن ارتقائی منازل طے کرنے اور دوستوں کے سمجھانے بجھانے سے جب صحیح مذاق پیدا ہوا تو اس بے رنگ مجموعہ کو رشک فارسی بنا دیا۔

غالب نے واقعی ''ریختہ'' کو رشک فارسی بنایا۔ انھوں نے اردو شاعری میں غزل کو اپنی جولا نگاہ بنایا اور یہ ان کی افتاد طبع کے عین مطابق تھا۔ اگرچہ انھوں نے دوسرے اصناف سخن میں بھی خامہ فرسائی کی مگر ان کی شاعرانہ عظمت ان کے تغزل کی مرہون محنت ہے۔

غالب نے میر کی قائم کردہ روایات تغزل سے بغاوت کرکے تنگنائے غزل میں بقدر شوق وسعتیں پیدا کیں اور اس کو جذبہ سے بڑھا کر فکری سرمایہ سے مالا مال کیا۔ ہر جذبہ کا نفسیاتی تجزیہ کرکے اس کا اتار چڑھاو معلوم کیا اور یوں غزل کا ایک مہکتا گلدستہ ترتیب دیا۔ میرے خیال میں غالب کی بقائے دوام کا راز اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ انھوں نے مضامین غزل کو نہایت اہم اور دقیق مسائل کی طرح مرکز توجہ بنا کر دقیق جذبہ اور نازک احساس کی تحلیل نفسی اس طور پر کی کہ بات سے بات پیدا ہوگئی اور شاعری گنجینۂ معنی کا طلسم بن گئی۔ بے شک اس میں ان کے

مخصوص اور تیکھے انداز ، نادر تراکیب و تشبیہات ، بعید از قیاس استعارات کو بھی بے حد دخل ہے مثلاً

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو بھی خموش ہے

ایک تو ظلمت کدے پھر شب غم کا جوش یعنی تاریکی سی تاریکی ، اس پر ایک شمع جس کا خودگل ہو جانا یا کر دیا جانا دلیل سحر ہوتا ہے اور پھر وہ بھی خموش کیا یہ شعر جذبات کا حشر برپا نہیں کرتا ۔ دنیائے دل میں ہنگامے کھڑے نہیں کرتا یوں غالب نے شاعری کو سوز و ساز دونوں سے بیک وقت نوازا ۔ غالب نے ایک ایسا مخلص دل پایا تھا جو ایک انسان کا محض ''دل مخلص'' تھا ۔ اس پر اگر کوئی حادثہ جانکاہ ٹوٹا تو وہ چیخا چلایا ۔ ہائے اور واویلا کی خوشی ملی تو اچھلا ، امید ہوئی تو نئی آرزؤں کو جنم دیا ۔ تمناؤں کو سیراب کیا اور یوں گفتہ غالب ہر دل کا آئینہ اور اس کی آپ بیتی جگ بیتی بنی پھر ہر قاری بول اٹھا ۔

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

نفسی تجزیہ یا تحصیل کی تفصیل کے سبب بعض اصحاب کو کلام غالب میں بہت کچھ تضاد بیانیاں نظر آئیں کیوں کہ اہل بینش ہونا کھیل لڑکوں کا نہیں ۔ مثلاً عشق کے متعلق غالب نے ایک شعر میں ''رونق ہستی'' اور ''خانہ ویران ساز'' سی تراکیب استعمال کیں جب کہ دوسرے شعر میں اسی عشق کو ''خلل دماغ'' کا بتایا ۔ بہ ظاہر تو واقعی یہ دو متضاد نظریے معلوم ہوتے ہیں مگر ذرا سی دقت نظر نے خلل دماغ اور خانہ ویران ساز کو سمجھ کر ایک مفہوم پیدا کر لیا کہ عشق مادی اعتبار سے دماغی خلل ہے مگر روحانی اعتبار سے رونق ہستی بھی ہے ۔

پھر غالب نے تصوف کے جن مضامین کو بیان کیا تو غضب کر گئے اور اس کے سبب ہم ان کو ''بادہ خوار'' ہوتے ہوئے بھی ولی سمجھتے ہیں ۔ انہوں نے وجود و ہستی ، بقا و فنا کے جن مضامین کی ہوا باندھی وہ پوری اردو شاعری میں اپنی مثال نہیں رکھتے ۔ پھر غالب نے اپنے آپ کو منکروں اور کافروں کے لیے دوزخ کا ایندھن تجویز کر کے جس راسخ عقیدہ کا اظہار کیا اس پر ایک عمر طبعی کا زہد و تقویٰ قربان ہے ۔

مختصراً غالب دنیائے دل اور دنیائے آب و گل ہر دو کے لیے باعث فخر ہیں ان کی شاعری بقول ڈاکٹر شوکت سبزواری تیر نیم کش ہے جو نہ آر ہوتا ہے نہ پار اور یوں دائمی خلش کا سبب بن کر غالب کی بقائے دوام کی ضامن ہے ۔

(زہرہ پروین ۔ وومن کالج راولپنڈی)

(۲)

غالب کو فوت ہوئے پورے سو سال ہونے کو ہیں اور جوں جوں وقت گزرتا چلا جاتا ہے غالب کی عظمت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ۔ لمحہ بہ لمحہ غالب کی شاعری اور نثر سے لوگ مختلف قسم کے معانی و مطالب وضع کر رہے ہیں اور ان کے فن کی خوبیوں میں خود بخود شان پیدا ہو رہی ہے ۔ آج کون سا ایسا طالب علم ہے جو غالب جیسے عظیم الشان شاعر کے نام اور فن سے واقف نہیں ۔ کئی شعراء اپنے وقت میں ملک الشعراء تھے اور سارے ہندوستان میں ان کا طوطی بولتا تھا مگر اب ان کو

ع نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں

کے بمصداق اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں کہ کہیں

ع اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

مگر غالب اب بھی جدید شاعر ہے ۔ بلکہ وقت کے ساتھ یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ غالب ایک جدید شاعر تھا ۔ غالب پرانے زمانے کا آدمی ہو کر بھی نئے زمانے کے تقاضے پورا کرتا ہے اور نئے تقاضوں کے ساتھ اس کا تعلق پرانے زمانے سے قائم ہے ۔ کل جبکہ غالب گویا اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا ؟

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ غالب ہماری نظر میں کیا ہے تو میں صرف یہی کہوں گا کہ غالب میری نظر میں غالب تھا ۔ وہ شخص اپنے نام کی تفسیر تھا ۔ اسم بامسمیٰ تھا ۔ اگر ہم ان کی زندگی پر نظر ڈالیں تو وہ ہمیں مصیبتوں کی یلغار ، مشکلات کی بھرمار ، زندگی بھر کے آزار اور اپنی تقریباً ہار کے باوجود غالب ہی نظر آتے ہیں ۔ اگر کوئی اور ہوتا تو میر تقی میر کی طرح آہیں بھر کر مر جاتا اور صرف سسکیوں کے سوا اور کوئی کام نہ کر پاتا ۔ یہ غالب کی ہمت تھی کہ ان تمام رکاوٹوں کا منہ پھیر کر رکھ دیا اور تمام عمر پریشانیوں کا منہ چڑاتا رہا اور زندگی کا مذاق اڑاتا رہا ۔

شاعری میں بھی اس کا پلہ بھاری ہے ۔ خودداری اور انفرادیت ملاحظہ ہو جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ کسی اور نے اپنا تخلص اسد رکھ لیا ہے تو جھٹ اپنا تخلص تبدیل کر لیتے ہیں ۔ ستائش کی پرواہ کیے بغیر ، کسی صلے کی تمنا نہ رکھتے ہوئے صرف اپنے دل کی بات کرتے ہیں ۔ صرف اسی خلوص کی وجہ سے ان کی شاعری آج بھی

زندہ ہے اور آئندہ بھی نہیں مر سکتی ۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب میرے اشعار میں آوے

غالب کی شخصیت بے حد نوکدار ہے ۔ ان کے خیالات میں بڑا تنوع ہے ۔ وہ بات کو نئے انداز میں کہنا زیادہ پسند کرتے ہیں ۔ ان کے اشعار میں جذبات کا طوفان نظر آتا ہے جو ابھرا چلا آتا ہے ۔ وہ منفی غم کے نمائندے نہیں ، ان کا غم مثبت پہلوؤں کا حامل ہے ۔ انہیں غم کا تجزیہ کرنے میں حظ ہوتا ہے ۔ یہی ان کی عظمت کی نشاندہی کرتی ہے ۔ وہ استعارات اور تلمیحات کے استعمال پر عبور رکھتے ہیں ۔ کہیں تو خودنگری اور خود آشنائی کو اپنے اشعار میں اجاگر کرتے ہیں اور کہیں انسانی اقدار کی تحریری وضاحت کرتے ہیں ۔ غالب کا ایک شعر آج کل کے بعض شاعروں کے پورے کلام پر بھاری ہے ۔

غالب نے نثر نگاری میں مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے ۔ میری نظر میں وہ بحیثیت نثر نگار بھی ایک منفرد مقام رکھتے ہیں ۔ آپ کے خطوط شخصی نثر کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ وہ شخصیت کی وساطت سے ماحول کا جائزہ لیتے ہیں اور جزئیات کے معاملے میں بڑی احتیاط برتتے ہیں ۔ مختصر مگر جامع نثر لکھنے میں غالب کو عبور حاصل ہے دراصل غالب کے متعلق میرا کچھ کہنا کچھ ایسا ہی ہے جیسا سورج کو چراغ دکھانا ۔ لیکن دھاگے کی ایک انٹی لے کر میں بھی یوسف کے خریداروں میں نام لکھوانے چلا ہوں ۔ میں کیا اور میری بساط کیا ۔ میں اس بلند مرتبت فنکار اور شاعر کے متعلق کیا کہوں کہ وہ میری نظر میں کیا تھا ۔ غالب کی شخصیت اتنی ہمہ گیر ہے کہ میری آنکھوں میں سما چکی ہے ۔ جہاں تک نظر پڑتی ہے غالب کا غلبہ نظر آتا ہے ۔

اجمل حسین چوھدری
گورنمنٹ انٹر کالج شیخوپورہ

(۳)

غالب پر لکھنے کو تو ایک دفتر چاہیے اور یہاں یہ قید کہ پانسو الفاظ سے زائد نہ ہوں یعنی گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل ۔ بہرحال کوشش کروں گی ۔ شاید اس سے عہدہ برآ ہو سکوں ۔ کیونکہ غالب کی ہمہ گیر اور پہلودار شخصیت ان حد بندیوں کی متحمل مشکل سے ہوگی ۔

غالب کے متعلق کہاں سے شروع کروں اور کیا لکھوں ۔ ایک طرف ان کی غزل اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے ۔ کیا ہے جو اس غزل میں نہیں ۔

عارفانہ رمز و کنایہ ، تصوف ، اخلاقیات ، شوخی و ظرافت غرض دو مصرعوں کی مختصر دنیا میں ایک جہان معنی بند ہے اور اس پر بھی گلہ ہے -

بقدر ذوق نہیں ظرف تنگنائے غزل

اور نثر کے میدان میں ان کی جولانی نیا رنگ دکھاتی ہے - درفش کاویانی ، قاطع برہان ، مہر نیمروز وغیرہ ان کی جودت طبع کا زندہ ثبوت ہیں اور مراسلہ نگاری کا تو جواب نہیں - گھسے پٹے فرسودہ القابات سے بغاوت کرکے انہوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے اور المکتوب نصف الملاقات کے مقولے میں تصرف یوں کیا کہ ان کا مراسلہ پوری ملاقات بلکہ اس سے بڑھ کر ہے -

قصائد بھی انہوں نے لکھے مگر یہ میدان ان کا نہ تھا - چنانچہ بقول خود تشبیب میں تو وہ جوں توں فارسی قصائد نگاروں تک جا پہنچتے ہیں مگر مدح ان کے بس کا روگ نہیں - یہ الفاظ ان کے فطری رجحان کا پتہ دیتے ہیں بلکہ میں تو کہوں گی کہ یہ چند الفاظ ان کی زندگی اور ان کے مزاج سے پردے اٹھاتے چلے جاتے ہیں اور ان کی شخصیت نکھر کر ہمارے سامنے آ جاتی ہے -غالب ، ایک عظیم و منفرد فنکار کے ساتھ ساتھ ایک عظیم و منفرد شخصیت کے مالک بھی تھے - یہی شان انفرادیت تھی جس نے انہیں ہمیشہ ماحول اور روایت سے بغاوت پر اکسایا - وہ طرز بیدل میں ریختہ اس لیے نہیں لکھتے کہ وہ بیدل کی طرح مشکل پسند ہیں - بلکہ اس میں ان کی انفرادیت نمایاں ہے - وہ عام روش سے ہٹ کر کچھ کہنا چاہتے ہیں اور ان کی سوچ کے انداز زمانے سے مختلف ہیں - ان کی طبیعت میں خودداری کا وہ جذبہ ہے کہ انہیں اپنے اشعار کے صلے میں نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پروا - وہ حقیقی معنوں میں ایک فن کار ہیں - ایسا فن کار جس کا فن دوسروں سے زیادہ اپنے لیے ہے کسی نے سچ کہا ہے -

There is delight in singing
Tho' none hear
Beside the singer

مگر ان کے نغمے صرف انہی کی روح کو سرشار نہیں کرتے بلکہ ان میں وہ آفاقیت ہے کہ کوئی بھی روح اس سحر سے آزاد نہیں - غالب کا دور بحرانی دور تھا - ایسا ہی ایک دور اس سے پیشتر بھی ہندوستان میں گزر چکا تھا ، جس کی زد میں آ کر میر قنوطی ہو کر رہ گئے تھے مگر غالب زندگی کے متعلق نہایت صحت مندانہ نظریہ رکھتے تھے- اور اسی لیے انہوں نے زندگی سے کبھی فرار اختیار نہیں کیا - بلکہ زندگی سے محبت نے ان کو زندگی کے متعلق ایسی آگہی بخشی تھی کہ دنیا ان کی نگاہوں میں بازیچہ اطفال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی اور شب و روز کے انقلابات و آلام ایک تماشہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے تھے - غالب کی یہی آگاہی ان کو زندگی سے قریب تر کر

دیتی ہے اور وہ نہایت ناساعد حالات میں بھی زندہ رہنے کی امنگ اپنے دل میں پاتے ہیں - یہی لگن اور یہی تڑپ ان کو اپنے زمانے میں ایک منفرد اور یکتا مقام بخشتی ہے - ایسا مقام جو اس زمانہ میں قابل قبول نہ تھا - مگر جو آج سب سے زیادہ قابل قبول ہے -

رضیہ تبسم گل

اسلامیہ کالج برائے خواتین لائل پور

(۲)

مرزا غالب کو ہندوستانی ادب میں محوری حیثیت حاصل ہے - گذشتہ صدی کے ہر نامور نقاد نے ان پر خامہ فرسائی کی ہے- جدید نثر ان کے گھر پیدا ہوئی - قدیم اردو انہیں کے گہوارے میں کھیل کود کر عالم شباب کو پہنچی - انہوں نے گلشن سخنوری میں نہایت دلفریب اور پرکشش و جانگداز گلوں کی تخم ریزی کی - پھر اس نو پیدا شدہ گلزار کی آبیاری خون جگر سے کی - ان کی جاں سپاری اور جگر کاوی کے انجام میں عالم بہار میں ان گلوں کی بہار رشک صد آسمان بن گئی -

خدائے واحد نے مرزا کو ایک جدت طراز و ندرت نواز طبع اور شوخی پسند وظرافت سنج ذہن سے نوازا تھا خود اعتمادی کا عنصر غالب کو دے رکھا تھا - جستجوئے ملک و منزل میں وہ منت کش احسان خضر ہونے کی بجائے ، مآل اندیشی سے کام لیتے ہوئے ہوس جستجو میں سرگرداں رہ کر ژرف بینی و فہم و فراست کے چراغ روشن کی مدد سے ، براہ راست راہ و رسم پیدا کرنے کے حامی ہیں - عامیانہ روش کی پابندی ان کے مذہب میں ناقابل عفو ہے - مرزا کی خود اعتمادی ، ہوس جدت طرازی ، عامیانہ روش سے بے نیازی اور چراغ دیدہ و دانش کے جواہر ہی تو ہیں جو انہیں نظم و نثر کے نقطہ عروج پر لے پہنچے -

قدیم نثر نگاروں کے نزدیک مسجع اور مقفیٰ عبارت آرائی کے لیے بعید از کار قافیوں غیر معروف و غریب تشبیہات کی بھرمار میں اصل مقصد خبط کر دینا ، فن انشا پردازی کی معراج متصور ہوتی تھی- مکتوب کے پہلے چند صفحات آداب والقابات کی نذر ہو جاتے تھے مگر مرزا صاحب بصیرت تھے - خرد و ہوش سے کام لینا جانتے تھے - انہیں فتویٰ کفر منظور تھا مگر نثر نگاری کے اس مذہب کی پابندی نا منظور - انہوں نے تو سن طبع کی باگ اس منزل کی جانب موڑ دی جس پر نثر مقصد کی وضاحت و صراحت کی آئینہ دار ہوتی ہے - انہوں نے دقیق و مغلق نثر کے ظلمت کدے میں وضاحت و سلاست کی مشعل فروزاں کی - مراسلے کو مکالمہ بنایا - سہل نگاری ، جزئیات نگاری اور مدعا نگاری— ان کی نثر کی خصوصیات ہیں - ان کے طرز بیاں کی تقلید سہل نہیں - ان کے مقلدین کو ان سے وہی نسبت ہے جو سحر سامری کو اعجاز موسوی سے

تا ابدالآ باد کوئی ان کے طرز بیان میں ان سے بازی نہیں لے جا سکتا ۔

جس طرح مرزا کی جدت طرازی و روش عام سے بے نیازی انہیں نثر میں یکتائے روزگار ہی نہیں بلکہ اپنے رنگ خاص میں لاثانی کر گئی ۔ اسی طرح مذکورہ عناصر ان کی شاعری کو زینۂ عروج پر لے پہنچے ۔ ان کے کلام سے پرمرغ تخیل کی حد رسائی کا اندازہ ہوتا ہے ۔

غالب کے فلسفہ کا محور ''دیدہ و دانش'' ہے ۔ ان کی شاعری حکمت و فرزانگی کی ترجمانی قانون راز کی نواسنجی ہے ۔ ان کی شاعری کا مقصد رخ قدرت کی نقاب کشائی اور ''آئینہ زدو دن و صورت معنی نمودن'' ہے ۔ مگر ان کی شاعری میں حیرت انگیز تنوع ہے ۔ زندگی کی گونا گوں کیفیات ، و واردات اور احساسات کا مد و جزر ، جذبات کا تلاطم ، مشاہدات ، عجز و انکسار ، فخر و سربلندی ، کامیابی ، ناکامی حسرت و یاس ، نفسیات محبت کی نقاب کشائی ، رفعت خیالات ، امید و رجا ، یاس و ، نا امیدی ، غم جاناں ، غم دوراں ، مرثیہ ، سوز و گداز ، شوخی و ظرافت ، فلسفہ ، دہریت ، دینیت ، زندگی کی گراں مائیگی ، کم مائیگی ، رواداری ، غرض ہزارہا انواع و اقسام کے خیالات وافکار ان کے گل شاعری میں باعث رنگ و بو ہیں ۔ زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ن کی نگہ ژرف بیں سے نہاں رہا ہو اس تنوع میں ان کا فلسفۂ زندگی مدون کرنا کچھ سہل نہیں ۔ وہ زندگی کے شاعر ہیں ۔ انسانی فطرت سے خوب آگاہ ہیں ۔ ان کی شاعری ایک شخص کی قلبی کیفیات کی آئینہ دار ہی نہیں بلکہ رموز ہائے حیات کی علمبر دار ہے ۔

مرزا کی دوسری امتیازی خصوصیات ان کی شوخی و ظرافت ہے جو مرثیوں اور تعزیت ناموں میں بھی ہاتھ سے نہیں جاتی ۔ انکے اشعار میں عرفی کا زور بیان اور بلند پروازیاں ہیں ۔ ان کے کلام میں معنی آفرینی کے وہ نمونے دستیاب ہیں جن سے دیوان غنی بھی عاری ہے ۔ وہ سرتاج الشعراء بند ہیں ۔ دیوان غالب دیوان حافظ کے جواب میں پیش کیا جا ۔ کتا ہے ۔ بجا طور پر دیوان غالب اردو شاعری کا دل ہے ۔ مرزا اردو کے شیکسپئر ہیں ۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ ان ژرف بین و دور اندیش شاعر کے فلسفیانہ اشعار کی حقیقت آشکار ہوتی جائیگی اور ان کی شہرت کا آفتاب اوپر اٹھتا آئے گا ۔ پھر معلوم ہوگا کہ کس طرح دست قدرت نے جملہ سر اس رباب کے تار میں جمع کر دیے تھے ۔ دیوان غالب جن کی صدائے باز گشت ہے ۔

زخمہ بر تار رگ جاں میزنم
کس چہ داند تا چہ داستاں میزنم

محمد اشرف عاصی ، گورنمنٹ کالج گوجرہ

(۵)

غالب ایک عظیم فنکار تھے ۔ ان کا کلام ان کی شخصیت کا عکس ، ان کی فطرت کا پر تو اور ان کی طبیعت کی لہر ہے ۔

غیرت ، عزت نفس ، خود بینی ، خود داری اور ظرافت آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔ وہ انسان کی عظمت کے قائل تھے اور اس کی ذلت دیکھ کر تڑپ اٹھتے تھے ع

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخئی فرشتہ ہماری جناب میں

غالب کی شخصیت میں ایک انفرادیت تھی ۔ یہی انفرادیت ان کے فن میں جھلکتی ہے ۔ ان کے طرز بیان میں جدت اور اشعار میں اچھوتا پن ہے ۔ وہ پامال راہ کو اپنانا اپنی توہین سمجھتے تھے ۔ اگر کسی پرانے مضمون کو نظم بھی کرتے تو اسے اپنے انداز بیان کی ندرت سے ایک نیا جامہ پہنا دیتے ۔ ان کی زبان ، ان کے اسلوب بیان ، ان کی تشبیہات ، ان کے استعارات اور ان کے محاکات سب میں ایک نیا حسن ہے ۔ آپ کی خود درای کا یہ حال ہے کہ کسی کا احسان اٹھانا گوارا نہیں کرتے ۔

غالب کے ہاں عشق کا ایک بلند معیار نظر آتا ہے ۔ وہ عشق میں بے چارگی ، افسردگی اور خواری کے قائل نہیں بلکہ اپنی وضع داری کو قائم رکھتے ہیں ۔ اگر محبوب بزم میں نہیں بلاتا تو وہ بھی اس سے راہ میں ملنا گوارا نہیں کرتے ۔ اگر محبوب اپنا انداز ترک نہیں کرتا تو وہ بھی اپنی وضع نہیں بدلتے ۔ وہ کسی کے سامنے سبک سر نہیں ہوتے ۔ یہ انداز سوائے غالب کے کسی اور شاعر کے ہاں نظر نہیں آتے ۔

غالب کی ایک اور خوبی ان کی شوخی اور ظرافت ہے ۔ لیکن اس ظرافت میں عامیانہ پن بالکل نہیں ۔ آپ کا قاری قہقہہ نہیں لگاتا بلکہ متبسم ہو جاتا ہے ۔ غالب کے ہاں رشک قابل دید ہے ۔ یہ جذبہ اتنی شدید صورت میں ہمیں کسی اور کے ہاں نظر نہیں آتا ۔ غالب کو نفسیات انسانی سے گہری واقفیت حاصل تھی اور انہوں نے انسانی جذبات کی اعلیٰ درجے کی ترجمانی کی ہے ۔ غالب جدت پسند ہی نہیں بلکہ دقت پسند بھی تھے ۔ ہر شخص کے لئے ان کے اشعار سمجھنا محال ہے ۔ بقول غالب

ع مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

غالب کو صرف اردو اور فارسی شاعری میں ہی مرتبہ حاصل نہیں بلکہ وہ جدید اردو نثر کے بانی بھی ہیں ۔ اردو نثر میں غالب نے دیباچے اور مختصر رسالے بھی لکھے جن کی عبارت کسی قدر پر تکلف ہے لیکن اردو نثر میں آپ کی شہرت کا دار و مدار آپ کے خطوط پر ہے آپ کے اردو مکاتیب آپ کی شاعری کے برعکس سادگی ، سلاست

اور بے ساختگی کا نادر نمونہ ہیں ۔ آپ نے القاب و آداب کا پرانا فرسودہ طریقہ ترک کر کے خطوط کو مکالمہ بنا دیا اور عبارت اس طرح لکھی گویا دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہوں ۔ عبارت میں شگفتگی اور انتہائی بے تکلفی کے ساتھ ساتھ ادبی لطافت درجۂ کمال پر نظر آتی ہے ۔ غالب اردو ادب میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ۔ ان کے اشعار میں قوس و قزح کے رنگ نظر آتے ہیں ۔ ان کے خطوط میں ادبی حسن ہے ۔ غرض ان کے قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ ایک آبدار موتی ہے خواہ وہ نظم کے لئے استعمال ہوا ہو یا نثر کے لئے ۔

(فوزیہ شکیل ۔ جامعہ نصرت ۔ ربوہ)

(۶)

انسان کے جسمانی اعضا میں دل کو سب سے زیادہ سریع الحس مانا گیا ہے ۔ اس کا تعلق روح سے ہوتا ہے ۔ احساس کی وہ شدت جو خدا نے دل کو عطا کی ہے وہ گردن کی رگوں کو ، آنکھ کی پتلی کو ، کمر کی ہڈی کو ، سینے میں پسلیوں کو نہیں بخشی گئی ۔ باد صبا کا خرام ، ابروئے ساقی کی خفی جنبش ، ماہ تاباں کی ایک کرن ، بلبل کی نغمہ سرائی ، دل پر اثر کیے بغیر نہیں رہتے لیکن تمام انسانوں کو خدا نے احساس کی یکساں دولت اور نعمت نہیں بخشی ۔ یہ ثروت کچھ شاعروں اور فن کاروں کو زیادہ میسر آتی ہے ۔ تاریخ ادبیات اردو کے ناموروں کو احساس کی رو سے تقسیم کیا جائے جسے اعضائے جسمانی کی تقسیم سے تو ہم غالب کو دل کا نام و مقام دے سکتے ہیں ۔ یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ غالب کا دل اتنا حساس ہے کہ وہ ہر چیز کو محسوس کر سکتا یا اس سے متاثر ہو سکتا ہے ۔ کہنا صرف یہ ہے کہ میرے نزدیک اگر تاریخ ادب کے دوسرے مشاہیر کو دوسرے اعضائے جسمانی کا درجہ دیا جائے تو غالب سر تا پا دل ہے ۔ واردات قلبی کا غالب کی نظر سے بچ جانا سوئی کے ناکے سے اونٹ کا نکل جانا ہے ۔

انسانی جذبات اور محسوسات کی ''واقعی'' عکاسی اور تصویر کشی ہر شخص کے بس کی بات نہیں ۔ یہ خدا کے سرفراز کرنے کا معاملہ ہے جسے سرفراز کر دے ۔ یہ یہ عطیہ الہی ہے یہ صلاحیت اکتسابی ہوتی تو کہا جا سکتا تھا کہ غالب نے مدرکات و محسوسات کے اظہار یا یوں کہہ لیجیے کہ غزل کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا اور مرنا جینا بنا لیا تھا لیکن حق تو یہ ہے کہ یوں حق ادا نہیں ہوتا ۔

میری نظر میں غالب کا تو یہ مقام ہے کہ غزل یعنی واردات قلبی کی نقشہ کشی غالب کا اپنا اختیار و انتخاب اور جذبات انسانی کی عکاسی خود ان کا دید و دریافت نہ تھی بلکہ انسانی احساسات کی سلطنت جسے کوئی بادشاہ نہ ملتا تھا ، یہ اس کی بازیافت تھی کہ اس نے غالب کو اپنا تاجدار بنا لیا ۔

عارف محمود
ایف سی کالج لاہور

(۷)

نظم اور نثر دونوں میں غالب کو استاد تسلیم کیا جاتا ہے اور کیا جاتا رہے گا جہاں تک میری معلومات اور مطالعے کا تعلق ہے ۔ زبان اردو کے بہت بڑے ماہر ، اپنے زمانے کے استاد کامل آسمان شاعری کے درخشندہ ستارے ، فلسفی شاعر ، شہنشاہ سخن مرزا اسداللہ خاں غالب کو بہت بلند مقام حاصل ہے ۔ وہ نہایت وسیع النظر اور کثیر المعلومات تھے ۔ وہ حقائق شعری کو سیدھے سادے الفاظ میں ادا کرنے کی بجائے مضمون کو تخیل کی پیچیدہ گھاٹیوں سے گذارتے تھے اور اسی شکل میں وہ اپنی خصوصیت اور ناموری سمجھتے تھے ۔ ان کے کلام میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بعض اوقات تو ان کی یہ بلند پروازیاں اور نازک خیالیاں اس قدر بلند ہو جاتی ہیں کہ نظروں سے اوجھل ہو کر شعر کا مطلب اور اثر بالکل جاتا رہتا ہے ۔ مرزا کے کلام میں وہ پختہ کاری وہ اثر اور وہ عمیق جذبات پائے جاتے ہیں جو ان کے بعد کے کسی شاعر میں نہیں پائے جاتے ۔ ان کے اشعار محض فارسی الفاظ کی لڑیاں معلوم ہوتے ہیں ۔ مرزا غالب کی رفتار طبع سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آئندہ کتنی ترق کرنے والے ہیں ۔ ان کے ابتدائی فکر میں بھی ایسی نازک خیالیاں اور پر لطف تشبیہیں نظر آتی ہیں جو ان کے زمانہ کے کسی اور شاعر میں نظر نہیں آتیں ۔

ان کے اشعار جامعیت اور اختصار میں فی الحقیقت اپنا جواب نہیں رکھتے ۔ مرزا کے کلام میں ندرت خیال کے ساتھ ساتھ لطافت اور کلام کی شستگی عجیب لطف دیتی ہے ۔ ان میں اختصار کے ساتھ ساتھ سادگی ، نازک خیالی اور جدت تخیل سب کچھ بدرجہ اتم ہے ، اور یہی وجہ ہے کہ مرزا غالب کو شعرائے اردو کی صف میں نہایت ممتاز جگہ ملی ہے اور وہ بانی اردو کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں ۔ ان کا کلام غم روزگار کو بھلانے کا ایک منفرد اور موثر ذریعہ ہے ۔

جہاں تک نثر کا تعلق ہے مرزا غالب نے نثر میں اپنے مزاج کے برعکس سلیس اور سادہ انداز تحریر کیا ۔ میرے خیال میں اگر انہیں نثر کا نقطہ آغاز کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا ۔ انہوں نے نثر کو ذاتی جذبات اور احساسات کے اظہار کا وسیلہ بنایا اور ایسی شکل دی جو کہ ہر طرف سے خوبصورت نظر آتی ہے ۔ نثر کی روانی اور سلاست کے علاوہ ان کی تحریر میں مزاح کا عنصر بھی پایا جاتا ہے ۔ یہ ٹھیک ہے کہ مرزا غالب پر تنقید کرنے سے پہلے نہایت وسیع مطالعہ کی ضرورت ہے ۔ ہر شخص کا اپنا انداز ہوتا ہے خواہ برا ہو یا بھلا ۔ اگرچہ بات کو مقفیٰ اور مسجع ادا کرنا کافی دقت طلب ہے لیکن باوجود اس کے یہ انداز دل کو بھاتا ہے ۔ بے تکلفانہ انداز تحریر اور اس پر ظرافت طبع نے چار چاند لگا دیے ۔ ان کے خطوط پڑھنے کے بعد گمان ہوتا ہے کہ ابھی ابھی مرزا غالب اپنی زبان سے باتیں کرتے اٹھ کر گئے ہیں ۔ انہوں

نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کے علاوہ نثر بھی لکھی ۔ اردو کی نثر تو خطوط تک ہی محدود رہی لیکن فارسی میں انہوں نے مغلیہ دور کی تاریخ کے سنہری باب قلمبند کیے ، جس کے مطالعہ کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ واقعی بہت عالم فاضل بھی تھے انہیں زبان پر مکمل اختیار تھا اور میں تو کہوں گا کہ بات کرنے کا ڈھنگ کوئی ان سے سیکھے ۔

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

منیر حسین شاہ
گورنمنٹ کالج جھنگ

فکر انسان پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو بزم سخن پیکر ترا
زیب محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوز زندگی ہر شے میں جو مستور ہے
محفل ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوت کوہسار
تیرے فردوس تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشت فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ وار
زندگی مضمر ہے تیری شوخی تحریر میں
تاب گویائی سے جنبش ہے لب تصویر میں

۔(اقبال)

غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

انتخاب کلام اردو و فارسی

- محمد حیات خان سیال
- خان محمد گلزار
- محمد نواز خان بلوچ
- نصرت کمیانہ

محمد دراز

حامد مختار پراچہ

اسلم ضیا

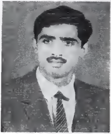
محمد نواز خاں بلوچ

محی الدین ضیا

نصرت کمیانہ

خان محمد گلزار

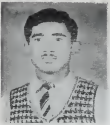
غلام شبیر سیال

اسلم کوثر

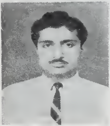
ظفر حسین

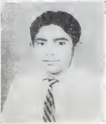
جاوید ہاشمی

فیاض شاہ

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سر گشتۂ خمار رسوم و قیود تھا
کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال، بیاباں نورد تھا

شوق ہر رنگ، رقیب سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل
جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردا ہے ساز کا

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا
مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا
نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تری مژگاں کا

ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا
اس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا
ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خون جگر ودیعت مژگان یار تھا
اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا
یاں سر پر شور بے خوابی سے تھا دیوار جو
واں وہ فرق ناز محو بالش کم خواب تھا
فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موج رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا
غم اگرچہ جانگسل ہے یہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روز گار ہوتا
یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ، ہے شمشیر کا عریاں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا
خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیا
ہیں گرفتار وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا
ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا ؟
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ ؟
شکیب خاطر عاشق ، بھلا کیا
بلائے جاں ہے غالب ! اُس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا
میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا
درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
ایک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی ، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقت سفر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

درد دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

اے دل نا عاقبت اندیش ضبط شوق کر
کون لا سکتا ہے تاب جلوہ دیدار دوست

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم اللہ اللہ
اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا
بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلہ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

وفور اشک نے کاشانہ کا کیا یہ رنگ
کہ ہوگئے مرے دیوار و در، در و دیوار

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاع سخن کے ساتھ
لیکن عیار طبع خریدار دیکھ کر
گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

پاتے ہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور
ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرائش خم کاکل
میں اور اندیشہائے دور دراز

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

آج ہم اپنی پریشانی خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں
ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے کو گہر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

غم ہستی کا اسد کسی سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ترے سرو قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفیٔ منصور نہیں

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں
رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغول حق ہوں ، بندگی بو تراب میں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں، تو ناچار کیا کریں

عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامی فرہاد نہیں

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

دائم پڑا ہوں ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گنہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں
نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں
ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ
سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

وفا داری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو
نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر ہوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو
جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

ہے وہ غرور حسن سے بیگانۂ وفا
ہر چند اس کے پاس دل حق شناس ہے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے
آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے دو چار ہے

خزاں کیا فصل گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

بس ہجوم نا امیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعی بےحاصل میں ہے
گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے بایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھئے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی
فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے
حوران خلد میں تری صورت مگر ملے

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا اک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
لکھتے رہے جنوں کی حکایت خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے
ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ایک ہنگامہ پر موقوف ہے گھر کی رونق
نوحہ غم ہی سہی نغمہ شادی نہی

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاش کہ تم میرے لیے ہوتے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش ہے غالب
کہ لگائے نہ لگے اوز بجھائے نہ بنے

رگ و پے میں جب اترے زہر غم تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
روک لو ، گر غلط چلے کوئی
بخش دو ، گر خطا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی
جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

رونے سے اور عشق میں بے باک ہوگئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہوگئے
کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہوگئے

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی
حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے
ہوئی جن سے توقع خستگی میں داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تیغ ستم نکلے
محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوت مژگاں کیے ہوئے
دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

شعلہ سے نہ ہوتی ہوس شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگی دل پہ جلا ہے

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے
مجبوری و دعوئ گرفتاری الفت
دست تہ سنگ آمدہ پیان وفا ہے
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملی داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

واعظ نہ خود پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی
گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملالیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

اہل ورع کے حلقہ میں ہر چند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے فرقہ میں میں برگزیدہ ہوں
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

لوں وام بخت خفتہ سے یک خواب خوش ولے
غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہ گزر باد یاں

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے
اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

انتخاب از نسخہ حمیدیہ

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کا ایک نقش پا پایا
کچھ کھٹکتا تھا مرے سینہ میں لیکن آخر
جس کو دل کہتے تھے سو تیر کا پیکاں نکلا
اے وائے غفلت نگہ شوق ورنہ یاں
ہر پارہ سنگ لخت دل کوہ طور تھا
انداز نالہ یاد ہیں سب مجھ کو پر اسد
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
عشق میں ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا
ورنہ جو چاہیے اسباب تمنا سب تھا
یک گام بے خودی سے لوٹیں بہار صحرا
آغوش نقش پا میں کیجیے فشار صحرا
بہ امید نگاہ خاص ہوں محمل کش حسرت
مبادا ہو عناں گیر تغافل لطف عام اس کا
پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہوا داروں کا
ہوا نہ مجھ سے بجز درد حاصل صیاد
بسان اشک گرفتار چشم دام رہا

قطع سفر ہستی و آرام فنا ہیچ
رفتار نہیں بیشتر از لغزش پا ہیچ
حیرت ہمہ اسرار پہ مجبور خموشی
ہستی نہیں جز بستن پیمان وفا ہیچ
کس بات پہ مغرور ہے اے عجز تمنا
سامان دعا وحشت و تاثیر دعا ہیچ

آہنگ اسد میں نہیں نغمہ بیدل
'عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ'

رکھتا ہے انتظار تماشائے حسن دوست
مژگان باز ماندہ سے دست دعا بلند
قربان اوج ریزی چشم حیا پرست
یک آسمان ہے مرتبہ پشت پا بلند
نوازش نفس آشنا کہاں ورنہ
برنگ نے ہے نہاں در ہر استخواں فریاد

ظلم کرنا گدائے عاشق پر
نہیں شایان حسن کا دستور
دوستو مجھ ستم رسیدہ سے
دشمنی ہے وصال کا مذکور
زندگانی پہ اعتماد غلط
ہے کہاں قیصر اور کہاں فغفور

رگ گل جادہ تار نگہ سے حد موافق ہے
ملیں گے منزل الفت میں ہم اور عندلیب آخر
اسد کی طرح میری بھی بغیر از صبح رخساراں
ہوئی شام جوانی اے دل حسرت نصیب آخر

اے آرزو شہید وفا خوں بہا نہ مانگ
جز بہر دست و بازوئے قاتل دعا نہ مانگ
میں دور گرد عرض رسوم نیاز ہوں
دشمن سمجھ ولے نگہ آشنا نہ مانگ

فرط بے خوابی سے ہیں شب ہائے ہجر یار میں
جوں زبان شمع داغ گرمی افسانہ ہم
جانتے ہیں جوشش سودائے زلف یار میں
سنبل بالیدہ کو موئے سر دیوانہ ہم

بسکہ وہ چشم و چراغ محفل اغیار ہے
چپکے چپکے جلتے ہیں جوں شمع ماتم خانہ ہم

تماشائے گلشن تمنائے چیدن
بہار آفرینا گنہگار ہیں ہم

غالب ہے رتبہ فہم تصور سے کچھ پرے
ہے عجز بندگی جو علی کو خدا کہوں

دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

ہوں گرمیٔ نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

خلق ہے صفحۂ عبرت سے ناخواندہ
ورنہ ہے چرخ و زمیں یک ورق گرداندہ
کوئی آگاہ نہیں باطن ہم دیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورق ناخواندہ

گاہ بہ خلد امیدوار گہ بہ جحیم بیم ناک
گرچہ خدا کی یاد ہے کلفت ما سوا سمجھ
نے سرو برگ آرزو نے رہ و رسم گفتگو
اے دل و جان خلق تو ہم کو بھی آشنا سمجھ

خوشا وہ دل کہ سراپا طلسم بے خبری ہو
جنون ویاس دائم رزق مدعا طلبی ہے

ہو سکے کب کلفت دل مانع طوفان اشک
گرد ساحل سنگ راہ جوشش دریا نہیں

کیا کہوں گرم جوشی میکش میں شعلہ رویاں کی
کہ شمع خانۂ دل آتش مے سے فروزاں کی
مجھے اپنے جنوں کی بے تکلف پردہ داری تھی
ولیکن کیا کروں آوے جو رسوائی گریباں کی

ہم مشق فکر وصل و غم ہجر سے اسد
لائق نہیں رہے ہیں غم روزگار کے

اے سر شوریدہ ناز عشق و پاس آبرو
یک طرف سودا ویک سو منت دستار ہے
اسد بہار تماشائے گلستان حیات
وصال لالہ عذاران سرو قامت ہے

گدائے طاقت تقریر ہے زباں تجھ سے
کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے
خود نامہ بن کے جائیے اس آشنا کے پاس
کیا فائدہ کہ منت بیگانہ کیجیے

اسد اٹھنا قیامت قامتوں کا وقت آرائش
لباس نظم میں بالیدن مضمون عالی ہے

انتخاب از نو دریافت بیاض غالب

فرو پیچیدنی ہے فرش بزم عیش گستر کا
دریغا گردش آموز فلک ہے دور ساغر کا
خط نوخیز کی آئینہ میں دی کس نے آرائش
کہ ہے تہ بندی پر ہائے طوطی رنگ جوہر کا

فزوں ہوتا ہے ہر دم جوش خوں باری تماشا ہے
نفس کرتا ہے رگھائے مژہ پر کام نشتر کا

تنگ ظرفوں کا رتبہ جہد سے برتر نہیں ہوتا
حباب مے بصد بالیدنی ساغر نہیں ہوتا
نہ رکھ چشم حصول نفع صحبت ہائے ممسک سے
لب خشک صدف آب گہر سے تر نہیں ہوتا

حلقہ گیسو کھلا دور خط رخسار پر
ہالۂ دیگر ، بہ گرد ہالۂ مہ ہو گیا

زندگی کے ہوئے ناگہ نفس چند تمام
کوچۂ یار جو مجھ سے قدم چند رہا
الفت زر ہمہ نقصان ہے کہ آخر قاروں
زیر بار غم دام و درم چند رہا

جگر سے ٹوٹی ہوئی ہو گئی سناں پیدا
دہان زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

نہاں کیفیت مے میں ہے سامان حجاب اس کا
بنا ہے پنبہہ مینا سے ساقی نے نقاب اس کا
عیاں کیفیت مے خانہ ہے جوئے گلستاں میں
کہ مے عکس شفق ہے اور ساغر ہے حباب اس کا

کرے ہے رہرواں سے خضر راہ عشق جلا دی
ہوا ہے موجۂ ریگ رواں شمشیر فولادی
نظربند تصور ہے قفس ہیں لطف آزادی
شکست آرزو کے رنگ کی کرتا ہوں صیادی

اس قامت رعنا کی جہاں جلوہ گری ہے
تسلیم فروشی روش کبک دری ہے

روشن ہوتی ہے یہ بات دم نزع کہ آخر
فانوس کفن بھر چراغ سحری ہے
ہم آئے ہیں غالب راہ تسلیم عدم سے
یہ تیرگی حال لباس سفری ہے

تماشائے جہاں مفت نظر ہے
کہ یہ گلزار باغ رہگذر ہے
جہاں شمع خموشی جلوہ گر ہے
پر پروانگاں بال شرر ہے
شفق ساں موجۂ خوں بے رگ خواب
کہ مژگان کشودہ نیشتر ہے
کرے ہے روئے روشن آفتابی
غبار خط رخ گرد سحر ہے
ہوئی یک عمر صرف مشق نالہ
اثر موقوف ہر عمر دگر ہے

انتخاب کلام فارسی

اے بہ خلاو ملا خوئے تو ہنگامہ زا
باہم در گفتگو بے ہم با ماجرا
شاہد حسن ترا در روش دلبری
طرۂ پرخم صفات موئے میان ما سوا
دیدہ وراں را کند دید تو بینش فزوں
از نگہ تیز رو گشتہ نگہ تو تیا
بزم ترا شمع و گل خستگی بو تراب
ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا

خاموشی ما گشت بد آموز بتاں را
زیں پیش وگرنہ اثرے بود فغاں را
منت کش تاثیر و فائیم کہ آخر
ایں شیوہ عیاں ساخت عیار دگراں را
موئے کہ بروں نامدہ باشد چہ نماید
بیہودہ در اندام جستیم میاں را

وداع ووصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو ، صد ہزار بار بیا

یار در عہد شبابم بہ کنار آمد و رفت
ہمچو عیدے کہ در ایام بہار آمد و رفت
شادی و غم ہمہ سرگشتہ تر از یک دگراند
روز روشن بوداع شب تار آمد و رفت
دل برد و حق آنست کہ دلبر نتواں گفت
بیداد تواں دید و ستم گر نتواں گفت
آں راز کہ درسینہ نہاں است نہ وعظ است
بردار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت
کارے عجب افتاد بدیں شیفتہ مارا
مومن نبود غالب و کافر نتواں گفت
ظہور بخشش حق را ذریعہ بے سببی ست
وگرنہ شرم گنہ در شمار بے ادبی است
رموز دین نشناسم درست و معذورم
نہاد من عجمی و طریق من عربی ست
بجام و آئینہ حرف جم و سکندر چیست
کہ ہرچہ رفت بہر عہد در زمانۂ تست

اگر بدل نہ خلد ہرچہ از نظر گزرد
زہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد

نومیدیٔ ما گردش ایام ندارد
روزی کہ سیہ شد سحر و شام ندارد
بلبل بہ چمن بنگر پروانہ بہ محفل
شوق ست کہ در وصل ہم آرام ندارد
بیا ورید گر ایں جا بود زباندانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

بیا و جوش تمنائے دیدنم بنگر
چو اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر

زمن بجرم تپیدن کناره می کردی
بیا بخاک من و آر میدنم بنگر

رفتم که کهنگی ز تماشا بر افگنم
در بزم رنگ و بو نمطے دیگر افگنم
دروجد اہل صومعہ ذوق نظارہ‌نیست
ناہید را بزمزمہ از منظر افگنم
تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

یاد باد آں روزگار آں کا عتبارے داشتم
آہ آتش ناک و چشم اشکبارے داشتم
خوئے تر دانستم اکنوں بہرمن زحمت‌مکش
رام بودم تا دل امید وارے داشتم

تا فصلے از حقیقت اشیا نوشتہ ایم
آفاق را مرادف عنقا نوشتہ ایم
آئندہ و گزشتہ تمنا و حسرت است
یک کاشکے بود کہ بصد جا نوشتہ ایم
بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بہ گردش رطل گراں مگردانیم
اگر ز شحنہ بود گیر دار و نندیشم
وگر ز شاہ رسد اومغاں بکر دانیم

تاز دایوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن
ایں مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوج قبولے بودہ است
شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن
حسن را از جلوۂ نازش تنش خواہد گداخت
نغمہ را از پردۂ سازش کفن خواہد شدن

زمن حذر نہ کنی گر لباس دیں دارم
نهفتہ کافرم و بت در آستیں دارم
اگر بہ طالع من سوخت خرسنم چہ عجب
عجب ز قسمت یک شہر خوشہ چیں دارم
نشستہ ام بگدای بشاہراہ و ہنوز
ہزار دزد بہر گوشہ در کمیں دارم
علی عالی اعلیٰ کہ در طواف درش
خرام بر فلک و پای بر زمیں دارم
بکوثر از تو کرا ظرف بیش قیمت بیش
بادہ خوی کسنم عقل دوربیں دارم

حق جلوہ گر ز طرز بیان ہست
آری کلام حق بزبان ہست
آئینہ دار پر تو مہرست ماہتاب
شان حق آشکار ز شان ہست
دانی اگر بمعنی لولاک وارسی
خود ہرچہ از حقست ازان ہست
ہر کس قسم بدانچہ عزیزست میخورد
سوگند کردگار بجان ہست
واعظ حدیث سایۂ طوبیٰ فرو گزار
کامینجا سخن ز سرو روان محمدست
غالب ثنائے خواجہ بیزداں گزاشتم
کاں ذات پاک مرتبہ دان ہست

خمسہ بر غزل مولانا قدسی

کیستم تا بخروش آوردم بے ادبی
قدسیان پیش تو در موقف حاجت طلبی
رفتہ از خویش بدیں زمزمۂ زیر لبی
مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جان باد فدائیت چہ عجب خوش لقبی

اے کہ روئے تو دہد روشنی ایمانم
کافرم کافر اگر مہر غیرش خوانم
صورت خویش . کشیدست مصور دانم
من بیدل بجمال تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی

اے گل تازہ کہ زیب چمنی آدم را
باعث رابطۂ جاں و تنی آدم را
کردہ در بوزۂ فیض تو غنی آدم را
نسبتی نیست بذات تو بنی آدم را
برتر از عالم و آدم تو چہ عالی نسبی

وصف رخش تو اگر در دل ادراک گذشت
نہ ہمیں است کہ از دائرہ خاک گذشت
ہم چو آن شعلہ کہ گرم از خس و خاشاک گذشت
شب معراج ، عروج تو از افلاک گذشت
بہ مقامیکہ رسیدی نرسد ہیچ نبی

دل ز غم مردہ و غم بردہ زما صبر و ثبات
غم گساری کن رہنمائی بما راہ نجات
داد سوز جگر ما چہ دہد نیل و فرات
ما ہم تشنہ لبانیم و توئی آب حیات
رحم فرما کہ زور می گزرد تشنہ لبی

غالب غمزدہ را نیست دریں غمزدگی
جز بہ امید ولائے تو تمنائے بہی
از تب و تاب دل سوختہ غافل نشوی
سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پے درماں طلبی

آج غالب غزل سرا نہ ہوا

غالب کی زمین میں غزلیں

کالج کے طلبا
سابق طلبا
اور
مقامی شعرا

(غالب ادبی مقابلہ میں اول قرار پائی)

محمود شام سابق طالب علم و مدیر کارواں
حال نائب مدیر اخبار جہاں کراچی ۔

ایک اظہار مدعا نہ ہوا
ورنہ حرف و زبان سے کیا نہ ہوا
چاندنی شب کا ریشمیں آنچل
کیوں کسی شوخ کی قبا نہ ہوا
اپنے دل کا چراغ روشن ہے
اور کوئی دیا ہوا نہ ہوا
رات کے اشک جھلملانے لگے
چاند جب بزم سے روانہ ہوا
آج بھی دل بجھا بجھا ہی رہا
آج بھی کوئی حادثہ نہ ہوا
ان کی ہر بات مستند ٹھہری
اپنا ہر واقعہ فسانہ ہوا
آج تک دل میں وہ زمانہ ہے
جس کو گزرے ہوئے زمانہ ہوا
عمر بھر شام جو رہا دل میں
وہ مرے دل سے آشنا نہ ہوا

(مقابلہ میں دوم قرار پائی)

(**سید افضل حسین اظہر** سابق طالب علم)
(استاد پشاور یونیورسٹی پشاور)

اپنے خیال خام کے حیراں کیے ہوئے
پھرتے ہیں چاک دل کا گریباں کیے ہوئے
حالات ناسزا کے موافق نہیں کہ ہم
ہیں شرمسار ذوق دل و جاں کیے ہوئے
دیکھ آئے ہم بھی جشن تماشائے نو بہار
اشکوں کو نذر صحن گلستاں کیے ہوئے
کیا کیا نہ خواب اپنے خیالوں میں آ بسے
تاراج آزمائش امکاں کیے ہوئے

شاید نہ مل سکیں کہیں ہم جیسے غم نصیب
سینے کو حسرتوں کا شبستاں کیے ہوئے
کب تک کریں ہم ان کے تغافل پہ اعتماد
دل کو حریف گردش دوراں کیے ہوئے
کیسے کٹے گی اے دل تنہا شب حیات
تاریکیوں میں اشک فروزاں کیے ہوئے
ترک جنوں کا ہم سے ارادہ نہ ہو سکا
ہر چند ہیں خرد کے پشیماں کیے ہوئے
ہم ڈھونڈتے ہیں کوئی سخن فہم چارہ گر
شعروں میں دل کا درد نمایاں کیے ہوئے
اظہر وہ مشکلیں اگر آساں نہ ہو سکیں
جن مشکلوں کے ہم ہیں پریشاں کیے ہوئے

(**کوثر جہاں**، گورنمنٹ کالج برائے خواتین راولپنڈی)

(مقابلہ میں دوم قرار پائی)

ظلم اس دل پہ کون سا نہ ہوا
کس ستم کا نہ یہ نشانہ ہوا
ایک وعدہ کبھی وفا نہ ہوا
بے وفا ان سا دوسرا نہ ہوا
دل کو تاب جمال تھی بھی کہاں
خیر گذری کہ سامنا نہ ہوا
پہلے آئینہ دیکھو پھر کہنا
کوئی ہم جیسا دوسرا نہ ہوا
دل وہ پژمردہ غنچہ ہے جو کبھی
اک تبسم سے آشنا نہ ہوا
ان پہ خود کو نثار کر دیتے
ہم سے یہ فرض بھی ادا نہ ہوا
ان کا وعدہ نہ تھا قیامت تھا
زندگی بھر کبھی وفا نہ ہوا
نہ گیا ساتھ کچھ بعد فنا
خاک قاروں کا خزانہ ہوا

کب رہے ان کی یاد سے غافل
گھر میں کس رات رت جگا نہ ہوا
ملتفت تھے وہ آج ہم کو مگر
حوصلہ عرض حال کا نہ ہوا
داغ سینے کا بجھ گیا کوثر
لیجیے گل چراغ خانہ ہوا

ڈاکٹر وزیر آغا

رات کے سیپ سے جب درد رہا ہوتا ہے
جسم تک سینکڑوں پلکوں پہ سجا ہوتا ہے
زخم دروازہ نہیں ہے کہ مقفل کر لیں
زخم ہر حال میں آغوش کشا ہوتا ہے
کبھی وہ نیلا سمندر ہے کبھی سبز زمیں
کبھی موجوں کبھی پھولوں میں گھرا ہوتا ہے
گرداڑتی ہے تو اٹ جاتے ہیں اشجار تمام
اوس گرتی ہے تو اک حشر بپا ہوتا ہے
ہم نے بھی دیکھے ہیں آواز کے کھلتے ہوئے رنگ
کوئی آنسو تجھے جب چھیڑ رہا ہوتا ہے
کم نہیں کرب کی لہروں کا تناؤ لیکن
چاند نکلے تو یہ طوفان سوا ہوتا ہے
روگ پھر روگ ہے پتھر کو بھی لگ سکتا ہے
درد دل میں کبھی تیرے سوا ہوتا ہے

سید جعفر طاہر

حسن الفاظ نہ یہ طرفہ معانی مانگے
آج کا دور تو آشفتہ بیانی مانگے
صبح اک زخم جو ہر گل کا گریبانی ہے
شام چھائے تو چمن مرثیہ خوانی مانگے
آنکھ اک ابر شفق رنگ بنے اور برسے
غم کی یہ آگ تو خوننابہ فشانی مانگے

اب جو اٹھے تو کماں بن کے اٹھے موج فرات
آج اک تیر مری تشنہ دہانی مانگے
یہ نگاہوں کا تحیر یہ زبانوں کا سکوت
اور کیا موت کی تو ہم سے نشانی مانگے
مژدہ امن و امان ذوق نمو حسن حیات
آج انداز بقا عالم فانی مانگے
کارواں تشنہ ہے یارب کوئی چشمہ پھوٹے
چشم صحرا کسی زمزم کی روانی مانگے
ہمت عشق سے نمرود خبر دار نہیں
آگ سے پھول تو پتھر سے یہ پانی مانگے
ہم تہی دست و سخن مست قلندر ٹھہرے
جانے کیا ہم سے یہ دنیا یہ دوانی مانگے
تخت دل پر اسے برسوں سے بٹھا رکھا ہے
کیا کروں یار تو اب تاج کیانی مانگے
غم فرہاد میں کیا پھوٹ کے روتے ہیں پہاڑ
ہائے کیا لہجہ شیریں یہ کہانی مانگے
دیکھ یہ طرز و طراز سخن و طور کلام
داد غالب سے مری ہیچمدانی مانگے
ہم شہنشاہوں سے واقف نہیں جعفر طاہر
ہم سے بیعت کوئی نوخیز جوانی مانگے

شیر افضل جعفری

حسن ازل کو زیست کے اس پار دیکھ کر
خوش ہوں میں اپنی موت کے آثار دیکھ کر
گھونگٹ میں خود عروس ازل گنگنا اٹھی
نوشاہ زندگی کو سردار دیکھ کر
آتی ہے یاد حافظ شیراز کی غزل
حور قضا کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
عرش بریں پہ شان خدا جھومنے لگی
مرد خدا کی عظمت کردار دیکھ کر

یوسف کیا ہے جدت افکار نے مجھے
بکتا ہوں مفت ذوق خریدار دیکھ کر
پروردگار قلب و نظر مسکرا دیا
انسان کو آدمی کا پرستار دیکھ کو
ایوان شہر یار میں لگتا نہیں ہے دل
آیا ہوں گنج بخش کا دربار دیکھ کر
گل واعظ حرم بھی مسلمان ہو گیا
عشق بتاں کی آگ میں گلزار دیکھ کر
کہنے لگے ہیں بوذر و سلمان مرحبا
مولا علی کا مجھ کو طرف دار دیکھ کر

رفعت سلطان

جو بھی افسردہ خطا نہ ہوا
وہ کبھی مائل دعا نہ ہوا
ہر کسی پہ تھا اعتماد مجھے
لیکن اس بات کو زمانہ ہوا
موت کی پستیوں کو چھو کر بھی
زندگی سے مجھے گلا نہ ہوا
دار پر مجھ کو کھینچنے والے
لب کشائی کو اک بہانہ ہوا
عمر بھر سوچتا رہا لیکن
ترک الفت کا حوصلہ نہ ہوا
اس کی ناکامیاں ہیں غور طلب
جو خدا بن کے بھی خدا نہ ہوا
میں گلے سے اسے لگا لوں گا
جس کا انداز دوستانہ ہوا
دیکھتا یہ ہے کون آئے گا
جب مرے گھر میں بوریا نہ ہوا
جی سکوں گا نہ ایک لمحہ بھی
دل میں جب کوئی ولولہ نہ ہوا
قابل فخر ہے وہ دل رفعت
ٹوٹ کر بھی جو بے صدا نہ ہوا

یوں مجھے آج مری تشنہ دہانی مانگے
جس طرح خواب میں بچہ کوئی پانی مانگے

کوئی چہرہ کسی چہرے کا مثنیٰ تو نہیں
دل تو پاگل ہے کہ مجھ سے ترا ثانی مانگے

اس کے خط اس کی تصاویر بھی واپس کر دوں
نامہ بر اس سے کہو اپنی زبانی مانگے

دل کی کس بات پہ میں کان دھروں صفدر جی
دل تو ایسا ہے کہ ہر شام سہانی مانگے

شب کی دہلیز پہ مبہوت ہے دن کا راجہ
اور سورج سے امان رات کی رانی مانگے

اتنا مشکوک ہے انساں کہ جہاں رات پڑے
میزبان پہلے شرافت کی نشانی مانگے

اسطرح چونک پڑی ذکر وفا پر دنیا
جیسے صحرا میں کسی سے کوئی پانی مانگے

یوں طبیعت پہ گراں باری شب طاری ہے
جیسے سنگلاخ زمین مصرع ثانی مانگے

گور کے آنگن میں بھی اب چین نہیں مل سکتا
اور کیا ہم سے تری ریشہ دوانی مانگے

خط حالات پہ خاموش کھڑا ہوں کب سے
جانے کس وقت مجھے دنیائے فانی مانگے

ہر طرف آج صلیبیں ہی نظر آتی ہیں
مجھ سے خلقت ہے کہ پھر شعلہ بیانی مانگے

حشر برپا ہے مرے ذہن کے ہر گوشے میں
وہ پری وش ہے کہ ہر خواب کہانی مانگے

آج لاشے بھی تہ تخت نظر آئے مجھے
اب تو پتھر یہ تیرا تاج شہانی مانگے

اے حسین ابن علی غرفہ دوراں سے نکل
صورت حال وہی رسم پرانی مانگے

جس نے تسخیر کیا وقت کے چنگیزوں کو
تجھ سے وہ چیز ترے ملک کا بانی مانگے

وہ کنارا نہ کنارے سے بغل گیر ہوا
جو فقط موجوں سے پیغام رسانی مانگے
اور کچھ روز میں دھرتی پہ لہو برسے گا
یہ زمین وقت سے خونابہ فشانی مانگے
تو کہ مصروف ہے جذبوں کی شناسائی میں
اور غالب کی زمیں گنج معانی مانگے
پھر بھڑک اٹھے ہیں جذبات سرشام سلیم
پھر طبیعت کسی دریا کی روانی مانگے

قدیر قیس

ماضی کے واقعات پہ جب بھی نظر گئی
افکار کے جہاں میں قیامت گزر گئی
جن کے لیے شباب کی راتیں اداس ہیں
ان کی جھلک خیال کی لو تیز کر گئی
ویرانہ حیات میں رقصاں ہیں غم کے بھوت
شاید انھی سے گردش حالات ڈر گئی
یاد آ گیا کسی کا تبسم اگر کبھی
پیشانی خیال پہ افشاں بکھر گئی
اے قیس دشت نجد کی کل ریز چاندنی
تصویر زندگی میں نیا رنگ بھر گئی

مظہر اختر

چاہے اچھا وہ ہمیں یا کہ برا کہتے ہیں
دوستو جو بھی وہ کہتے ہیں بجا کہتے ہیں
آ گیا قافلہ موج صبا کہتے ہیں
پھر پپیہے نے پکارا ہے پیا کہتے ہیں
چھاؤں میں گیسوؤں کی اپنے چھپا لو مجھ کو
ڈھونڈتے پھرتے ہیں ایام بلا کہتے ہیں
آج کل خوف سا طاری ہے دلوں پر اختر
آج کل ہم بھی سہاروں کو خدا کہتے ہیں

سید انیس شیرازی

کب تک رکھوں گزرتے دنوں کو حساب میں
تصویر اپنی دیکھ رہا ہوں حباب میں
وہ تو فقط ہوا کی گرہ تھی کہ پڑ گئی
ورنہ کوئی بساط ہی کیا تھی حباب میں
اس شعلۂ بدن سے بدن جل گیا مگر
کب تک رکھو گے ذہن کو ٹھنڈی شراب میں
یارو نہ اس کا ذکر میرے سامنے کرو
ورنہ وہ شخص مجھ کو ستائے گا خواب میں
دم بھر ہوا کا زور تھمے تو میں دیکھ لوں
کتنا حسین وہ نظر آتا ہے آب میں
جتنے تھے پھول اس پہ نچھاور کیے مگر
اس نے نہ کوئی سنگ ہی پھینکا جواب میں
چلیے انیس شام سے بستر پہ لیٹ جائیں
شاید وہ آج ملنے آ جائے خواب میں

انیس انصاری

داغوں کو سوز غم سے فروزاں کیے ہوئے
مدت ہوئی ہے گھر میں چراغاں کیے ہوئے
وحشت میں کوئی چاک گریباں کیے ہوئے
گزرا ہے چشم شوق کو حیراں کیے ہوئے
اے کیف انتظار یہ کیسا ہجوم شوق
بیٹھے ہیں در پہ وعدہ و پیماں کیے ہوئے
باد صبا سے کہہ دو کوئی نیم جاں بھی ہے
گزرے نہ زلف یار پریشاں کیے ہوئے
سوتے ابل پڑے ہیں تو بہنے بھی دے انیس
مدت تلک تھے درد کو پنہاں کیے ہوئے

حامد مختار پراچہ

جاؤں گا یونہی داور محشر کے رو برو
زخموں سے سینے کو میں گلستاں کیے ہوئے
آمد کا ان کے شور ہوا ہے جہان میں
زخموں کو دل کے ہم ہیں چراغاں کیے ہوئے
اپنی شب فراق کی صبح محال ہے
کیا قصہ ہے تو اے شب ہجراں کیے ہوئے
ان حسرتوں کو گاڑ دو یارو زمین میں
کس درجہ ہیں یہ سب کو پریشاں کیے ہوئے
پھر آئے ہیں وہ لیتا ہوں اٹھ اٹھ کے میں قدم
زخم جگر کو سرو چراغاں کیے ہوئے
پھر ناقہ لے کے دشت سے لیلیٰ گزر گئی
لیلائے شب ہے زلف پریشاں کیے ہوئے
احباب کے لیے ہے حامد مثال شمع
تار نفس کو شعلہ بداماں کیے ہوئے

اسلم ضیا

ٹوٹے ہوئے دلوں کی تمنا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
پھر دل میں بے پناہ تلاطم ہے موجزن
طوفان اضطراب ! تمنا کہیں جسے
حسرت میں ایک عمر سے ہی داغ داغ ہے
وہ ایک نقش نقش سویدا کہیں جسے
آنکھوں سے اب عیاں ہے وہ برسات کا سماں
افراط جوش اشک کہ دریا کہیں جسے
کیوں کارواں میں اس کو برا جانتا ہوں میں
وہ راہبر ضیا کہ سب اچھا کہیں جسے

افتخار نسیم

دیوار و در بھی ہیں مجھے حیراں کیے ہوئے
ہر ایک گھر ہے چاک گریباں کیے ہوئے
شعلہ بدن چاٹ گئی ہے سیاہ شب
نکلا تھا میں تو خود کو فروزاں کیے ہوئے
ڈر میں بدل گیا ہے مری خواہشوں کا شور
اب تو ہوں شہر دل کو ویراں کیے ہوئے
بڑھتی ہی جا رہی ہے مرے دل کی تیرگی
بیٹھا ہوا ہوں گھر میں چراغاں کیے ہوئے
اک روح تھی کہ قید میں آ کر نکل گئی
اک میں کہ جسم کو رہا زنداں کیے ہوئے
پلکوں پہ جم گیا ہے نمی کا غبار سا
آنکھوں میں آ گئے ترے احساں کیے ہوئے
جیسا بھی تھا بھلانا پڑے گا تجھے نسیم
کب تک پھرے گا خود کو پریشاں کیے ہوئے

تاج محمد خاں

تہذیب اپنے آپ کو عریاں کیے ہوئے
ہے منتشر نمائش انساں کیے ہوئے
ان آنسوؤں کی دھند میں پہنچانتا ہے کون
ہم لوگ زندگی کو ہیں زنداں کیے ہوئے
پتھر لگے تو جھیل میں بھی سلوٹیں پڑیں
چہرے سے حال دل ہیں نمایاں کیے ہوئے
یہ داغ داغ روشنی یہ زخم زخم پھول
ہے وقت آج درد کو ارزاں کیے ہوئے
پھر یوں ہوا کہ میں نہیں سمجھا تمام عمر
وہ راز جو تھا شوق کا ساماں کیے ہوئے
دیر و حرم سے اجنبی بن کر گذر گئے
تیرا خیال مشعل ایماں کیے ہوئے
دل میں لگی ہوئی تھی جو یکسر بجھا گئے
آنسو تھے میرے درد کا درماں کیے ہوئے
ہم تاج منزلوں سے بھی آگے نکل گئے
ہر زندگی کے مرحلے آساں کیے ہوئے

احمد تنویر

خط پڑھا تو یہ کھلا عقدہ تیری تحریر کا
میری مانند اب تجھے بھی ہے گلا تقدیر کا
میں تیری نفرت کا پتھر میں تیرے قدموں کی دھول
اور تو اک پھول میرے خواب کی تعبیر کا
عمر بھر کا ساتھ کل ان سے اچانک یوں چھٹا
جیسے حلقہ ٹوٹ جائے سانس کی زنجیر کا
سرو قد زلفیں گھنی ، چہرہ گلابی ، مست نین
چال اس کی جس طرح رنگ تغزل میر کا
حق ہمیشہ حق رہے گا غم نہ کر میرے حبیب
داؤ کب تقدیر پہ چلتا ہے کس تدبیر کا
شعر چاہے جیسے ہوں تنویر لیکن شعر میں
سوز ہونا چاہیے احساس کے نخچیر کا

———

معین تابش

تابش وہ میری زیست میں شامل نہیں رہا
لمحہ جو ان کے درد کا حامل نہیں رہا
دیوانگان عشق کہاں جا کے سو گئے
زنداں میں آج شور سلاسل نہیں رہا
کیا بات ہے کہ آئندہ شوق دیکھ کر
چہرے پہ ان کے پھول کوئی کھل نہیں رہا
اس کو لگی ہے کس کی نظر کچھ پتہ نہیں
اب دل حریف بازوئے قاتل نہیں رہا
وہ منزلیں ہیں نور کا مینار ان دنوں
جن منزلوں پہ ساتھ مرے دل نہیں رہا

———

غلام محمد رنگیں

الہی الہی حسن گویائی تری تصویر کا
بن گیا عنوان کتاب شوکت تقریر کا
چشم صحرا آشنا سے دیکھ ویرانوں سے پوچھ
ہر بگولا ایک خاکہ ہے نئی تعمیر کا
یاد ہے اب تک وہ ہم کو جشن زنداں کا سماں
نغمہ بر لب تھا جنوں اور ساز تھا زنجیر کا
ہو جو آئینے سے فرصت اس طرف بھی اک نظر
میرا دل بھی دوسرا رخ ہے تیری تصویر کا
ناتوانی ہائے جذب حسرت دل ۔ الاماں
اب خدا حافظ ہے میرے نالہ شب گیر کا
جب میری توبہ پہ اک تو بہ شکن بدلی ہنسی
میکدے کے در پہ گونجا قہقہہ زنجیر کا
اڑ رہا ہے بجلیوں کی سمت رنگیں آشیاں
اب یہ عالم ہے میری فریاد کی تاثیر کا

چوہدری خلیل

ہر ایک صفحہ رنگیں پہ نقش دلبر کھینچ
کتاب ہستی ناکام پر بہ منظر کھینچ
خدا کا تو ہی تو نائب ہے کام لے دل سے
قعر کے بحر سے نایاب کوئی گوہر کھینچ
تو اپنا دست کرم ہر طرف بڑھا ساقی
ذرا ہماری بھی جانب کو ایک ساغر کھینچ
وہاں کا حال تو مجھ تک قفس میں پہنچا دے
چمن کی بو کو ادھر بھی اے باد صرصر کھینچ
خلیل آیا ہے جان و دل و جگر لے کر
کسی پہ تیر چلا اور کسی پہ خنجر کھینچ

بیدل پانی پتی

دل میں پرائے درد کے آثار دیکھ کر
حیراں ہوں دشت میں در و دیوار دیکھ کر
لاکھوں لہو کے پھول کھلے ہیں نگاہ میں
دل کی طرف جو دیکھا رخ یار دیکھ کر
کیا کیا بھنور پڑے ہیں سر سطح دل نہ پوچھ
ٹھنڈی ہوا کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
کانٹے کو پھول، پھول کو شعلہ، ہوا کو آگ
کہنا پڑا ہے وقت کی رفتار دیکھ کر
صورت گر ازل کے ستم یاد آئے ہیں
گلشن میں چشم نرگس بیمار دیکھ کر
ہم بھی قتیل غمزہ آب و ہوا ہوئے
ہم نے بھی پی ہے ابر گہر بار دیکھ کر
بیدل ہمارے دل میں بڑے واہمے اٹھے
منصور عصر کو سر دار دیکھ کر

طاہر سردھنوی

وہ جو نکلا بھی تو نزدیک رگ جاں نکلا
عرش تخیل پہ گویا مہ تاباں نکلا
دل سے کانٹا کسی صورت، کسی عنوان نکلا
جان تو خیر نکلنی ہی تھی، ارماں نکلا
سر سے پا تک وہی غنچوں کے چٹکنے کی ادا
دیکھیے سیر گلستاں کو گلستاں نکلا
اس کی نظروں کا یہاں تک فسوں طاری ہے
عکس بھی آئینہ دل سے گریزاں نکلا
موسم گل میں کوئی جوشش جنوں کی حد ہے
میں نے دامن کی خبر لی تو گریباں نکلا
جس نے گھیرا ہے یہ طوفان تو ٹل جائے گا
فرض کیجیے جو سفینے میں بھی طوفاں نکلا
آج طاہر سے بہت دیر ملاقات رہی
واقعی وہ تو بڑے کام کا انساں نکلا

کبیر انوز جعفری

سبز پتوں کی جو تو مجھ سے نشانی مانگے
ایسے ہے جیسے کوئی اپنی کہانی مانگے
تو نے یوں آج کیا مجھ سے اشارہ ساقی
موت کے وقت کوئی جیسے کہ پانی مانگے
جنبش لب بھی نہ ہو، ہات بھی آگے نہ بڑھے
لطف تو جب ہے کہ وہ پھر بھی زبانی مانگے
آج تک لوٹ کے آیا نہ عدم سے کوئی
وقت پیری جو کوئی لطف جوانی مانگے
مثل شبیر نہ تیغ جھادے سر کو
بعد مرنے کے جو تو نغز بیانی مانگے
اشک حسرت کے سوا کچھ بھی نہ ہوگا حاصل
خوگر درد سے جو گنج معانی مانگے
پانی ہے سامنے پر ہوش کہاں ہے یارو
بحر حسرت میں جو بہتا ہو وہ پانی مانگے
ساحل بحر کی پھر خیر نہیں ہے انور
موج - دریا سے اگر آج روانی مانگے

اصغر شاھیہ

تھے زہر سے بھرے ہوئے ناخن بہار کے
پھر زخم تازہ ہو گئے ہر شاخسار کے
رشتے ہیں سو غموں سے دل بے قرار کے
کچھ پاس کے عزیز ہیں کچھ دور پار کے
شاید نظر پڑے کوئی شہکار دل پذیر
پردے الٹتے جائیے لیل و نہار کے
پاگل درخت سائے کی شہرت کے واسطے
پتے بکھیرتے ہیں بطور اشتہار کے
اصغر ہوئی تھی ایک ہی نیکی اسی نے آج
پتھر گرا دیا ہے دہانے پہ غار کے

حسرت و یاس لے کے لوٹ آئی
جب نظر تیرے در سے ٹکرائی
جل رہے ہیں گلوں کے پیراہن
فصل گل بھی نہ ہم کو راس آئی
ضرب پڑتی ہے دل کے تاروں پر
جب بھی بجتی ہے کوئی شہنائی
گرم آنسو ہیں سرد آہیں ہیں
زیست نے کیا متاع غم پائی
پھر بنایا ہے آشیاں میں نے
پھر سر چرخ برق لہرائی
کس کی خوشبوئے زلف نے اختر
کائنات حیات مہکائی

———

حامد مختار پراچہ

جاؤں گا یونہی داور محشر کے رو برو
زخموں سے سینے کو میں گلستاں کیے ہوئے
آمد کا ان کے شور ہوا ہے جہان میں
زخموں کو دل کے ہم ہیں چراغاں کیے ہوئے
اپنی شب فراق کی صبح محال ہے
کیا قصہ ہے تو اے شب ہجراں کیے ہوئے
ان حسرتوں کو گاڑ دو یارو زمین میں
کس درجہ ہیں یہ سب کو پریشاں کیے ہوئے
پھر آئے ہیں وہ لیتا ہوں اٹھ اٹھ کے میں قدم
زخم جگر کو سرو چراغاں کیے ہوئے
پھر ناقہ لے کے دشت سے لیلیٰ گزر گئی
لیلائے شب ہے زلف پریشاں کیے ہوئے
احباب کے لیے ہے حامد مثال شمع
تار نفس کو شعلہ بداماں کیے ہوئے

——— شمع

—

اسلم ضیا

ٹوٹے ہوئے دلوں کی تمنا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
پھر دل میں بے پناہ تلاطم ہے موجزن
طوفان اضطراب! تمنا کہیں جسے
حسرت میں ایک عمر سے ہی داغ داغ ہے
وہ ایک نقش نقش سویدا کہیں جسے
آنکھوں سے اب عیاں ہے وہ برسات کا سماں
افراط جوش اشک کہ دریا کہیں جسے
کیوں کارواں میں اس کو برا جانتا ہوں میں
وہ راہبر ضیا کہ سب اچھا کہیں جسے

———

افتخار نسیم

دیوار و در بھی ہیں مجھے حیراں کیے ہوئے
ہر ایک گھر ہے چاک گریباں کیے ہوئے
شعلہ بدن چاٹ گئی ہے سیاہ شب
نکلا تھا میں تو خود کو فروزاں کیے ہوئے
ڈر میں بدل گیا ہے مری خواہشوں کا شور
اب تو ہوں شہر دل کو ویراں کیے ہوئے
بڑھتی ہی جا رہی ہے مرے دل کی تیرگی
بیٹھا ہوا ہوں گھر میں چراغاں کیے ہوئے
اک روح تھی کہ قید میں آ کر نکل گئی
اک میں کہ جسم کو رہا زنداں کیے ہوئے
پلکوں پہ جم گیا ہے نمی کا غبار سا
آنکھوں میں آ گئے ترے احساں کیے ہوئے
جیسا بھی تھا بھلانا پڑے گا تجھے نسیم
کب تک پھرے گا خود کو پریشاں کیے ہوئے

تاج محمد خاں

تہذیب اپنے آپ کو عریاں کیے ہوئے
ہے منتشر نمائش انساں کیے ہوئے
ان آنسوؤں کی دھند میں پہنچانتا ہے کون
ہم لوگ زندگی کو ہیں زنداں کیے ہوئے
پتھر لگے تو جھیل میں بھی سلوٹیں پڑیں
چہرے سے حال دل ہیں نمایاں کیے ہوئے
یہ داغ داغ روشنی یہ زخم زخم پھول
ہے وقت آج درد کو ارزاں کیے ہوئے
پھر یوں ہوا کہ میں نہیں سمجھا تمام عمر
وہ راز جو تھا شوق کا ساماں کیے ہوئے
دیر و حرم سے اجنبی بن کر گذر گئے
تیرا خیال مشعل ایماں کیے ہوئے
دل میں لگی ہوئی تھی جو یکسر بجھا گئے
آنسو تھے میرے درد کا درماں کیے ہوئے
ہم تاج منزلوں سے بھی آگے نکل گئے
ہر زندگی کے مرحلے آساں کیے ہوئے

احمد تنویر

خط پڑھا تو یہ کھلا عقدہ تیری تحریر کا
میری مانند اب تجھے بھی ہے گلا تقدیر کا
میں تیری نفرت کا پتھر میں تیرے قدموں کی دھول
اور تو اک پھول میرے خواب کی تعبیر کا
عمر بھر کا ساتھ کل ان سے اچانک یوں چھٹا
جیسے حلقہ ٹوٹ جائے سانس کی زنجیر کا
سرو قد زلفیں گھنی ، چہرہ گلابی ، مست نین
چال اس کی جس طرح رنگ تغزل میر کا
حق ہمیشہ حق رہے گا غم نہ کر میرے حبیب
داؤ کب تقدیر پہ چلتا ہے کس تدبیر کا
شعر چاہے جیسے ہوں تنویر لیکن شعر میں
سوز ہونا چاہیے احساس کے نخچیر کا

معین تابش

تابش وہ میری زیست میں شامل نہیں رہا
لمحہ جو ان کے درد کا حامل نہیں رہا
دیوانگان عشق کہاں جا کے سو گئے
زنداں میں آج شور سلاسل نہیں رہا
کیا بات ہے کہ آئندہ شوق دیکھ کر
چہرے پہ ان کے پھول کوئی کھل نہیں رہا
اس کو لگی ہے کس کی نظر کچھ پتہ نہیں
اب دل حریف بازوئے قاتل نہیں رہا
وہ منزلیں ہیں نور کا مینار ان دنوں
جن منزلوں پہ ساتھ مرے دل نہیں رہا

غلام محمد رنگیں

الہہ الہہ حسن گویائی تری تصویر کا
بن گیا عنوان کتاب شوکت تقریر کا
چشم صحرا آشنا سے دیکھ ویرانوں سے پوچھ
ہر بگولا ایک خاکہ ہے نئی تعمیر کا
یاد ہے اب تک وہ ہم کو جشن زنداں کا سماں
نغمہ بر لب تھا جنوں اور ساز تھا زنجیر کا
ہو جو آئینے سے فرصت اس طرف بھی اک نظر
میرا دل بھی دوسرا رخ ہے تیری تصویر کا
ناتوانی ہائے جذب حسرت دل ۔ الاماں
اب خدا حافظ ہے میرے نالہ شب گیر کا
جب میری توبہ پہ اک توبہ شکن بدلی ہنسی
میکدے کے در پہ گونجا قہقہہ زنجیر کا
اڑ رہا ہے بجلیوں کی سمت رنگین آشیاں
اب یہ عالم ہے میری فریاد کی تاثیر کا

چوھدری خلیل

ہر ایک صفحہ رنگیں پہ نقش دلبر کھینچ
کتاب ہستی ناکام پر یہ منظر کھینچ
خدا کا تو ہی تو نائب ہے کام لے دل سے
قفر کے بحر سے نایاب کوئی گوہر کھینچ
تو اپنا دست کرم ہر طرف بڑھا ساقی
ذرا ہماری بھی جانب کو ایک ساغر کھینچ
وہاں کا حال تو مجھ تک قفس میں پہنچا دے
چمن کی بو کو ادھر بھی اے باد صرصر کھینچ
خلیل آیا ہے جان و دل و جگر لے کر
کسی پہ تیر چلا اور کسی پہ خنجر کھینچ

بیدل پانی پتی

دل میں پرانے درد کے آثار دیکھ کر
حیراں ہوں دشت میں در و دیوار دیکھ کر
لاکھوں لہو کے پھول کھلے ہیں نگاہ میں
دل کی طرف جو دیکھا رخ یار دیکھ کر
کیا کیا بھنور پڑے ہیں سر سطح دل نہ پوچھ
ٹھنڈی ہوا کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
کانٹے کو پھول، پھول کو شعلہ، ہوا کو آگ
کہنا پڑا ہے وقت کی رفتار دیکھ کر
صورت گر ازل کے ستم یاد آئے ہیں
گلشن میں چشم نرگس بیمار دیکھ کر
ہم بھی قتیل غمزہ آب و ہوا ہوئے
ہم نے بھی پی ہے ابر گہر بار دیکھ کر
بیدل ہمارے دل میں بڑے واہمے اٹھے
منصور عصر کو سر دار دیکھ کر

طاہر سردھنوی

وہ جو نکلا بھی تو نزدیک رگ جاں نکلا
عرش تخیل پہ گویا مہ تاباں نکلا
دل سے کانٹا کسی صورت، کسی عنوان نکلا
جان تو خیر نکلنی ہی تھی، ارماں نکلا
سر سے پا تک وہی غنچوں کے چٹکنے کی ادا
دیکھیے سیر گلستاں کو گلستاں نکلا
اس کی نظروں کا یہاں تک فسوں طاری ہے
عکس بھی آئینہ دل سے گریزاں نکلا
موسم گل میں کوئی جوشِ جنوں کی حد ہے
میں نے دامن کی خبر لی تو گریباں نکلا
جس نے گھیرا ہے یہ طوفان تو ٹل جائے گا
فرض کیجیے جو سفینے میں بھی طوفاں نکلا
آج طاہر سے بہت دیر ملاقات رہی
واقعی وہ تو بڑے کام کا انساں نکلا

کبیر انورؔ جعفری

سبز پتوں کی جو تو مجھ سے نشانی مانگے
ایسے ہے جیسے کوئی اپنی کہانی مانگے
تو نے یوں آج کیا مجھ سے اشارہ ساقی
موت کے وقت کوئی جیسے کہ پانی مانگے
جنبش لب بھی نہ ہو، بات بھی آگے نہ بڑھے
لطف تو جب ہے کہ وہ پھر بھی زبانی مانگے
آج تک لوٹ کے آیا نہ عدم سے کوئی
وقت پیری جو کوئی لطف جوانی مانگے
مثل شبیر نہ تیغ جھادے سر کو
بعد مرنے کے جو تو نغز بیانی مانگے
اشک حسرت کے سوا کچھ بھی نہ ہوگا حاصل
خو گر درد سے جو گنج معانی مانگے
پانی ہے سامنے پر ہوش کہاں ہے یارو
بحر حسرت میں جو بہتا ہو وہ پانی مانگے
ساحل بحر کی پھر خیر نہیں ہے انور
موج۔ دریا سے اگر آج روانی مانگے

اصغر شاھیہ

تھے زہر سے بھرے ہوئے ناخن بہار کے
پھر زخم تازہ ہو گئے ہر شاخسار کے
رشتے ہیں سو غموں سے دل بے قرار کے
کچھ پاس کے عزیز ہیں کچھ دور پار کے
شاید نظر پڑے کوئی شہکار دل پذیر
پردے الٹتے جائیے لیل و نہار کے
پاگل درخت سائے کی شہرت کے واسطے
پتے بکھیرتے ہیں بطور اشتہار کے
اصغر ہوئی تھی ایک ہی نیکی اسی نے آج
پتھر گرا دیا ہے دہانے پہ غار کے

سہیل اختر

حسرت و یاس لے کے لوٹ آئی
جب نظر تیرے در سے ٹکرائی
جل رہے ہیں گلوں کے پیراہن
فصل گل بھی نہ ہم کو راس آئی
ضرب پڑتی ہے دل کے تاروں پر
جب بھی بجتی ہے کوئی شہنائی
گرم آنسو ہیں سرد آہیں ہیں
زیست نے کیا متاع غم پائی
پھر بنایا ہے آشیاں میں نے
پھر سر چرخ برق لہرائی
کس کی خوشبوئے زلف نے اختر
کائنات حیات مہکائی

———

موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

جاوید ہاشمی

غالب کی شوخیاں

حالی نے یادگار غالب لکھ کر جہاں غالب اور غالب کے مداحوں پر سینکڑوں احسانات کئے ہیں وہاں ایک ستم ظریفی یہ بھی کی ہے کہ غالب کی حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور شوخئی طبع کے بیشتر واقعات کو لطیفہ لکھ کر بیان کیا ہے حالانکہ غالب نے لطیفے نہیں کہے بلکہ ان پر کچھ لطیفے سر زد ہو گئے اور اس کا سبب ان کی فطری شگفتگی ہے جو غم میں بھی ان کے لبوں کو آشنائے خندہ رکھتی ہے۔

ذیل میں ان کی شوخی کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

ایک مجلس میں مرزا صاحب اور شیخ ابراہیم ذوق دونوں موجود تھے۔ مرزا صاحب نے میر تقی میر کی تعریف کی ذوق نے سودا کو میر تقی پر ترجیح دی۔ مرزا جناب ذوق سے فرماتے ہیں۔

''میں تو آپ کو میری سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں''

ایک دفعہ مرزا صاحب مکان بدلنا چاہتے تھے ایک مکان خود جا کر دیکھا مگر اس کی محلسرا نہ دیکھ سکے۔ اس کو دیکھنے کے لئے اپنی بیوی کو بھیجا۔ جب وہ واپس آئیں تو ان سے مکان کی کیفیت پوچھی۔ انہوں نے کہا ''اس مکان میں تو لوگ بلا بتاتے ہیں مرزا صاحب بولے ''کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھکر کوئی بلا ہے ؟''

ایک دفعہ دیوان فضل‌اللہ خاں مرحوم چرٹ میں سوار مرزا صاحب کے مکان کے پاس سے بغیر ملے نکل گئے۔ مرزا کو معلوم ہوا تو انہوں نے ایک رقعہ دیوان صاحب کو لکھا۔ مضمون یہ تھا کہ :

''آج مجھ کو اس قدر ندامت ہوئی ہے کہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا

ہوں ۔ اس سے زیادہ کیا اور نالائقی ہو سکی کہ آپ کبھی نہ کبھی تو اس طرف سے گذرے اور میں سلام کو حاضر نہ ہو سکا ۔''
جب یہ رقعہ دیوان جی کے پاس پہنچا تو وہ نہایت شرمندہ ہوئے اور اسی وقت گاڑی میں سوار ہو کر مرزا صاحب سے ملنے آئے۔

بعد رہائی میاں کالے حضرت محمد نصیرالدین جو بہادر شاہ کے پیر تھے ، ان کے مکان میں آ کر رہے ۔ ایک روز میاں صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کسی نے آ کر قید سے چھوٹنے کی مبارکباد دی ۔ مرزا صاحب نے جواب دیا ''کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے ۔ پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں ۔''

مولانا حالی لکھتے ہیں کہ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم ناقل تھے کہ ایک مجلس میں جناب مرزا صاحب بھی موجود تھے ۔ آموں کی نسبت گفتگو ہو رہی تھی ہر شخص اپنی اپنی رائے بیان کر رہا تھا کہ آم میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہیں ؟ مولانا فضل حق خیر آبادی نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ آپ کی رائے میں آم کیسا ہونا چاہیے ؟ مرزا صاحب نے جواب دیا ''بھئی میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہیں میٹھا ہو اور بہت ہو''۔ یہ سن کر سب سامعین ہنس پڑے :

حکیم رضی الدین خاں جو مرزا صاحب کے گہرے دوست تھے ان کو آم نہیں بھاتے تھے ۔ ایک دن وہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے اور مرزا بھی وہیں موجود تھے ایک گدھے والا اپنے گدھے لیے ہوئے گلی سے گذرا ، آم کے چھلکے پڑے ہوئے تھے ۔ گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیے ۔ حکیم صاحب نے کہا ۔ ''دیکھیے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا'' ۔ مرزا صاحب نے کہا ''بیشک گدھا آم نہیں کھاتا'' ۔

ایک دفعہ ایک شخص نے مرزا صاحب کے سامنے شراب کی برائیاں بیان کیں اور کہا کہ شرابی کی دعا قبول نہیں ہوتی ۔ مرزا صاحب بولے ''بھائی ، جس کو شراب میسر ہے ، اسکو اور کیا چاہیے جس کے لیے دعا مانگے'' ۔

رمضان کا مہینہ تھا مولوی عبدالقادر دہلوی مرزا سے ملنے آئے عصر کا وقت تھا ۔ مرزا نے خدمتگار سے پانی مانگا ۔ مولوی صاحب نے تعجب سے کہا ۔ جناب کا روزہ نہیں ہے'' ۔ مرزا نے کہا ''سنی مسلمان ہوں چار گھڑی دن رہے روزہ کھول

لیتا ہوں‘‘ ۔

ایک دفعہ بہادر شاہ نے مرزا صاحب سے پوچھا ’’مرزا تم روزہ کیوں نہیں رکھتے‘‘ مرزا صاحب نے عرض کیا پیرومرشد جب کھانے کو نہیں ملتا تو روزہ ہی کھا لیتا ہوں‘‘ بادشاہ یہ سن کر ہنس دیے ۔

افطار صوم کی کچھ اگر دست گاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

ایک روز بہادر شاہ آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ جس میں مرزا بھی تھے باغ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے ۔ آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لد رہے تھے ۔ یہاں کا آم بادشاہ یا سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسر نہیں آ سکتا تھا ۔ مرزا بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھتے تھے ۔ بادشاہ نے پوچھا مرزا اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو ۔ مرزا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا ۔ پیرومرشد یہ جو کسی بزرگ نے کہا ہے ۔

بر سر ہر دانہ بنوشتہ عیاں کاین فلاں ابن فلاں ابن فلاں

اس کو دیکھتا ہوں کہ کس دانہ پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام لکھا ہے یا نہیں ۔ بادشاہ مسکرا دیے اور اسی روز ایک بہنگی آموں کی مرزا کو بھجوائی ۔

غدر کے بعد جب کہ پنشن بند تھی اور دربار میں شریک ہونے کی اجازت ہوئی تھی پنڈت موتی لعل میر منشی لفٹنٹی پنجاب مرزا صاحب سے ملنے کو آئے ۔ کچھ پنشن کا ذکر چلا ۔ مرزا صاحب نے کہا ’’تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار پھر میں نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھے باغی مسلمانوں میں شمار کیا‘‘ ۔

ہنگامہ کے بعد باز پرس ہونے لگی ۔ مرزا صاحب بھی بلائے گئے کرنل براؤن کے رو برو ہو گئے ۔ انہوں نے مرزا کی وجہ وضع دیکھ کر پوچھا کہ ’’ویل تم مسلمان‘‘ ؟ مرزا نے کہا ۔ ’’آدھا‘‘ ۔ کرنل نے کہا ’’اس کا مطلب‘‘ مرزا بولے ’’شراب پیتا ہوں ، سور نہیں کھاتا‘‘ ۔ کرنل یہ سن کر ہنسنے لگا اور آپ کو اعزاز کے ساتھ رخصت کیا ۔

مرزا کے خاص خاص شاگرد اور دوست جن سے نہایت بے تکلفی تھی اکثر شام کو ان کے پاس جا کر بیٹھتے اور مرزا سرور کے عالم میں اس وقت بہت پر لطف باتیں کیا کرتے تھے ۔

ایک روز میر مہدی مجروح بیٹھے ہوئے تھے اور مرزا پلنگ پر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے ۔ میر مہدی پاؤں دابنے لگے ۔ مرزا نے کہا "بھئی تو سید زادہ ہے مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے" ۔ انہوں نے نہ مانا اور کہا "آپ کو ایسا خیال ہے تو پیر دابنے کی اجرت دے دیجیے گا" ۔ مرزا نے کہا "ہاں اس کا مضائقہ نہیں" ۔ جب وہ پیر داب چکے تو انہوں نے اجرت طلب کی ۔ مرزا نے کہا "بھیا کیسی اجرت تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمہارے پیسے دابے حساب برابر ہوا" ۔

لکھنؤ کی ایک صحبت میں دلی اور لکھنؤ کی زبان پر گفتگو چھڑی ۔ ایک صاحب نے مرزا سے کہا کہ جس موقعہ پر اہل دلی اپنے تئیں بولتے ہیں ۔ وہاں اہل لکھنو آپ کو بولتے ہیں ۔ آپ کی رائے میں فصیح "آپ کو" ہے یا اپنے تئیں ۔ "مرزا صاحب نے کہا" فصیح تو یہی معلوم ہوتا ہے جو آپ بولتے ہیں مگر اس میں دقت یہ ہے کہ مثلاً آپ میری نسبت یہ فرمائیں کہ میں آپ کو فرشتہ خصائل جانتا ہوں اور میں اس کے جواب میں اپنی نسبت یہ عرض کروں کہ میں تو آپکو کتے سے بھی بد تر سمجھتا ہوں تو سخت مشکل واقع ہو گو میں تو اپنی نسبت لکھوں گا اور آپ ممکن ہے کہ اپنی نسبت سمجھ جائیں" ۔ سب حاضرین یہ لطیفہ سن کر پھڑک گئے ۔

دلی میں رتھ کو بعضے مونث اور بعض مذکر بولتے ہیں کسی نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ "حضرت ! رتھ مذکر ہے یا مونث" ؟ آپ نے کہا "بھیا ! جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مونث کہو اور جب مرد بیٹھیں تو مذکر سمجھو" ۔

طفیل شیخ

کہتی ہے تجھ کو خلق خدا

★ ''ہندوستان کی مقدس کتابیں دو ہیں مقدس وید اور دیوان غالب''
(عبدالرحمن بجنوری)

★ ''غالب جدت ادا کا امام ہے'' (ڈاکٹر یوسف حسین)

★ ''غالب ہماری ادبی تاریخ میں سب سے زیادہ زندہ شاعر ہے'' (آفتاب احمد)

★ ''غالب ایک محشر خیال ایک مجموعہ اضداد ہے ۔ اس کے لبوں پر ہنسی لیکن دل میں طوفان غم ہے ۔ اس کی زبان پر خوشامد ہے لیکن اس کا تصور عرش پر ہے ۔ اسے مظاہر سے ایک شدید لگاؤ ہے لیکن بے نیازی اس کا مسلک ہے ۔ وہ زندگی کو ایک متاع گراں بہا سمجھتا ہے لیکن موت اس کی عزیز ترین منزل ہے'' (ڈاکٹر وزیر آغا)

★ ''ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو حیوان ناطق کے بجائے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے'' (الطاف حسین حالی)

★ ''دیوان غالب کو ہم نئی نسل کی انجیل کہہ سکتے ہیں'' (ڈاکٹر محمد حسن)

★ غالب کے وہ اشعار بھی جو زندگی کی تلخیوں کے تکلیف دہ مناظر پیش کرتے ہیں اپنے اندر ایک لطیف مزاح مضمر رکھتے ہیں'' (ڈاکٹر احسن فاروق)

★ غالب کا ہاتھ انسانی نبض پر ہے اور یہ نبض آج بھی اسی طرح چلتی ہے جس طرح سو برس ، پانچ سو برس ، ایک ہزار برس پہلے چلتی تھی ۔
(حمید احمد خاں)

★ غالب کے کلام میں ایک خاص تیور و آہنگ پایا جاتا ہے جو منفرد ہے ۔
(اختر اورینوی)

* غالب کا شاعرانہ وجود ہماری نسل حاضر کو ایسے آئیڈیل عطا کرتا ہے جو زندگی کے معرکے میں شمشیر بے نیام ہیں -

(ظ - انصاری)

* زندگی مضمر ہے تری شوخئی تحریر میں

(علامہ اقبال)

* غالب نہ ہوتا تو ابھی حالی اور اقبال کی متوازن ، سنجیدہ اور زندگی سے آنکھیں ملا سکنے والی شاعری کے وجود میں آنے میں نہ جانے کتنی دیر لگتی -

(مجنوں گورکھپوری)

* اگر شاعری کو ایک کہکشاں تسلیم کر لیا جائے تو اس کا سب سے زیادہ شوخ اوز حسیں ستارہ غالب کو ماننا پڑے گا -

(کوثر چاند پوری)

* اردو میں شاید وہ تنہا شاعر ہیں جن کی شاعری دل نشین اور دلاویز ہونے کے ساتھ ساتھ خیال انگیز اور فکر خیز بھی ہے

(ڈاکٹر عبادت بریلوی)

فیاض قریشی

ہے مکرر لب ساقی پہ صلا مرے بعد

رشک عرفی و فخر طالب مرد
اسداللہ خان غالب مرد — مجروح

اے وہ کہ تیری ذات گرامی بہ ہمہ ہرنگ
قدرت کی جو ہم راز فطرت کی ہم آہنگ
ہر پھول تیرے باغ کا فردوس بہ دامن
ہر خار تیرے دشت کا انگشت شفق رنگ
تھے ملک سخن میں تیرے ہم عصر ہزاروں
تنہا تھی تری ذات مگر صاحب اورنگ
عرفی و نظیری و ظہوری و فغانی
تیرا کوئی ہم سر نہ تیرا کوئی ہم آہنگ — (جگر مراد آبادی)

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو بزم سخن پیکر ترا
زیب محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوز زندگی ہر شے میں جو مستور ہے — (اقبال)

کعبہ اہل نظر مدفن غالب ہے یہی
محو خواب اک دل بیدار اسی خاک میں ہے
ہے اسی خواب میں گنجینہ معنی کا طلسم
جنس حکمت کا خریدار اسی خاک میں ہے
سو رہا ہے یہیں نقاش اجنتائے غزل
ادبی تاج کا معمار اسی خاک میں ہے (شمیم کرہانی)

گلزار جہاں سے باغ جنت میں گئے
مرحوم ہوئے جوار رحمت میں گئے
مداح علی کا مرتبہ اعلیٰ ہے
غالب اسداللہ کی خدمت میں گئے (انیس)

قدسی و صائب و اسیر و کلیم
لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ کھلوائیں
غالب نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت (حالی)

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

[پروفیسر صاحبان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ غالب کا پسندیدہ شعر تحریر فرمائیں۔ کہا جاتا ہے کہ کسی شخص کی پسند اسی کے مزاج کی عکاسی کرتی ہے۔آپ کی کیا رائے ہے ؟]

(اسلم ضیا)

●

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

پروفیسر محمد عبدالسعید (پرنسپل)

●

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

پروفیسر خالد اکرام (بیالوجی)

●

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

سمیع اللہ قریشی (اسلامیات)

●

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

عبدالروف جال (انگریزی)

●

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

محمد حیات خاں سیال (اردو)

●

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

ملک غلام محمد (ریاضی)

●

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

مظہر علی (کیمسٹری)

●

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

احمد سعید انصاری (فارسی)

●

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

خلیل اللہ خاں (اردو)

●

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

عبدالباری عباسی (اردو)

●

پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

محمد سرور (فارسی)

●

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

عبدالرحمن خاں (اسلامیات)

●

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

محمد اسلم (انگریزی)

●

طاعت میں تا رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

محمد یوسف (فزکس)

●

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

محمد حنیف (اکنامکس)

●

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ابوبکر صدیقی (اردو)

●

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

محمد خان (جغرافیہ)

●

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

جی ایم ملک (اردو)

●

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ایم بی کوکب (عربی)

●

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

سجاد اختر (بیالوجی)

●

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

فیض محمد (فزکس)

●

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

مختار حسین (تاریخ)

●

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے
بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

نثار احمد (تاریخ)

●

نقش فریادی ہے کس کی شوخئ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

جہانگیر عالم (سیاسیات)

●

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

یعقوب علی بٹ (انگریزی)

●

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

محمد جمیل (اکنامکس)

●

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

محمد اطہر (انگریزی)

●

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

محمد سعد اللہ (انگریزی)

●

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

غلام انور (فزکس)

●

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوہ اہل نظر گئی

محمد مجتبیٰ احمد (ریاضی)

●

رات کے وقت مے پئے ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

محمد اشرف خاں (فلاسفی)

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

محمد صدیق (فزکس)

●

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ریاض حسین رضا (بیالوجی)

●

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

محمد اشرف محمود (کیمسٹری)

●

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

محمد اسلم (کیمسٹری)

●

دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

نصیر احمد روہیلہ (جغرافیہ)

●

بس ہجوم نا امیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

ایس ایم شفیق (ڈی پی ای)

●

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی
محمد حسین واہلہ (ڈی پی ای)

●

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے
محمد صدیق (لائبریرین)

●

وہ بادۂ شبانہ کی سر مستیاں کہاں
اٹھیئے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی
مہر سکندر خاں (ہیڈ کلرک)

●

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
پروفیسر ثاقب علی خاں (کیمسٹری)

●

غالب کا انٹرویو

[مرزا غالب کرسئ صداوت پر جلوہ افروز ہیں ، جناب ایم اے سعید پرنسپل ساتھ والی کرسی پر تشریف فرما ہیں۔ تمام پروفیسر صاحبان اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے ہیں - خاموشی کا عالم ہے - جناب پرنسپل صاحب مہر سکوت توڑتے ہیں -]

پرنسپل : حضرات ! آج ہم یہاں اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ پاک و ہند کے عظیم شاعر سے متعارف ہوں اور کارواں کے لیے غالب نمبر کے ان کا انٹرویو لیں - آپ مرزا کی شخصیت و زندگی وغیرہ کے بارے میں سوال کر سکتے ہیں - اس کی ابتدا میں کرتا ہوں۔

مرزا صاحب ! آپ کا اصل نام کیا ہے -

غالب : ہم اسداللہم و اسداللہیم -

پرنسپل : جناب میں فارسی سے نابلد ہوں - ریاضی پڑھاتا ہوں -

غالب : مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

پرنسپل : آپ کا تخلص کیا ہے ؟

غالب : پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

پرنسپل : اپنے آباؤ اجداد کے متعلق بھی ارشاد فرمائیے -

غالب : سو پشت سے پیشۂ آبا سپہ گری -

پرنسپل : حضرات ! اب آپ سوال کیجیے ، مجتبیٰ صاحب ، اتنی دیر میں آپ مرزا صاحب کا ٹائم ٹیبل تیار کریں -

مجتبیٰ احمد : جناب کل سے اسی کوشش میں ہوں - ہر بار Clash ہو جاتا ہے -

اس ایم شفیق : مرزا صاحب ! آپ کی صحت بہت کمزور ہے صبح سویرے گراؤنڈ کے چار چکر لگایا کریں -

محمد حسین واهله : باسکٹ بال کھیلنا بھی مفید ہے ، ویسے کب سے یہ روگ لگا ہے ؟

غالب : اڑنے سے پیشتر ہی میرا رنگ زرد تھا

سیال : یہ عشق کا روگ بھی جان لیوا ہوتا ہے - مرزا صاحب بچنے کی کوشش کیجیے -

غالب : عشق پہ زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

خالد اکرام : کیا آپ نے ذوالوجی بھی پڑھی ہے ؟
(مرزا صاحب کچھ سمجھ نہیں پاتے)

سیال : مرزا صاحب ! اکرام صاحب دراصل آپ کی تعلیم کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں -

غالب : لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

سمیع اللہ قریشی : آپ نے اردو اور فارسی میں اشعار کہے ، غضب کر دیا - اگر پنجابی میں بھی لکھا ہوتا تو ہم پنجابیوں پر احسان کرتے - مثلاً اگر یوں لکھتے
ایہ کتھے اساڈی قسمت سی وصال یار ہوندا

غالب : (منہ پھیر کر) گفتہ ، غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کے یوں

سمیع اللہ : اچھا چھوڑیے ان باتوں کو - خدا کے متعلق کیا نظریہ ہے -

غالب : ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

عبدالرحمن : آپ کا نبی؟

غالب : واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا

سیال : آپ کا پیشوا ؟

غالب : مصروف حق ہوں بندگی بو تراب میں

محمد حیات خاں سیال

پروفیسر ایم اے سعید (پرنسپل)

انیس انصاری

سید داور علی سحر

پروفیسر محمد سرور

پروفیسر عبدالباری عباسی

پروفیسر سمیع اللہ قریشی

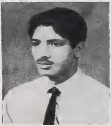

منیر حسین شاہ جوہر

مظہر علی رانا

طفیل شیخ

محمد اشرف : مرزا صاحب آپ کے نزدیک معیار ایمان کیا ہے ؟

غالب : وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے

جی ایم ملک : لیکن اگر اس دعوے کا نفسیاتی لحاظ سے تجزیہ کیا جائے تو کئی چیزیں سامنے آتی ہیں یہ کعبہ اور کلیسا کا چکر کیسا ؟

غالب : کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

محمد حنیف : مرزا صاحب سنا ہے آپ نے قصیدے لکھ لکھ کر بہت سی رقم کمائی اور اپنا مکان بھی بنوایا ۔

محمد جمیل : سنگلاخ زمینوں کو پانی کرتے رہے ۔ کئی ٹریکٹر بھی خریدے ۔ کافی بنک بیلنس ہوگا ؟

غالب : رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

محمد جمیل : جی میں سمجھا نہیں ۔

غالب : سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

روبی جلال : مرزا صاحب ! کیا آپ کے یہاں "ویلا" کی برانچ ہے انہوں نے کوئی پیغام تو نہیں دیا ؟

غالب : کہ جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

احمد سعید انصاری : وہ جنت والی حسرت پوری ہوئی یا نہیں ۔

غالب : دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اقبال بھٹی : مرزا صاحب حورو غلمان کے متعلق بھی ارشاد فرمائیے ؟

غالب : جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
ایسی جنت کا کیا کرے کوئی

محمد خان : مرزا صاحب جنت کا نقشہ چاہیے ۔ جغرافیہ کے نصاب میں شامل کرایا گیا ہے ۔

خالد اکرام : نقشے کی ایک نقل مجھے بھی درکار ہے ۔

غالب : (سوچ کر) یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

نصیر احمد : وہاں کا موسم کیسا ہے ؟

غالب : بر شکالِ گریۂ عاشق ہے دیکھا چاہیے

محمد یوسف : کیا وہاں بھی اتنی گرمی پڑتی ہے ۔ یہاں تو برا حال ہے ۔

غالب : آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں

خلیل اللہ خاں : مرزا صاحب بڑے افسوس کی بات ہے آپ نے ابھی تک ڈرامیٹک کلب کا ذکر نہیں کیا ۔ کاش آپ نے میرا ڈرامہ ''تبسم کی سزا'' دیکھا ہوتا اگر پسند فرمائیں تو ہماری کلب وہاں بھی یہ ڈرامہ سٹیج کر سکتی ہے ۔

عبدالباری عباسی : یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ ''تبسم کی سزا'' کا اہم کردار شیطان ہے اور اس کا جنت میں کیا کام ۔

غالب : کیوں نہ جنت کو دوزخ میں ملا لیں یا رب

عباسی : نہیں کیا ضرورت ہے آپ میرا ڈرامہ ''الجھن'' سٹیج کرائیں ۔ کیا وہاں کوئی ڈرامیٹک کلب ہے ۔ محمد عمر ، نورالٰہی ، آغا حشر اور اب تاج صاحب بھی ۔

غالب : ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

محمد سرور : کبھی بیروت دیکھنے کا اتفاق بھی ہؤا ؟

غالب : (آہ سرد بھر کر) اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

غلام محمد : آپ کی شادی ہوئی تھی یا اطہر صاحب کی طرح کنوارے رہے ۔

اطہر صاحب : ملک صاحب اپنا نام کیوں نہیں لیتے ۔ غلام انور بھی بیٹھے ہیں ۔

غلام محمد : ہاں مرزا صاحب اگر آپ کی شادی ہوئی تھی تو بیوی کہاں ہے ؟

غالب : تیرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

عباسی : کچھ بچوں کے بارے میں بھی بتائیے ۔

غالب : بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشہ کوئی دن اور

محمد اسلم : آپ کس شاعر سے زیادہ متاثر ہیں ۔

غالب ! کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

جہانگیر عالم : (عینک صاف کر کے بولے) قطع کلام معاف - ہوسٹل میں آج دال پکی ہے - مرزا صاحب آپ کیا کھانا پسند فرمائیں گے ؟

غالب : بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

سجاد اختر : مرزا صاحب ! آج تو آپ بہت خوش خوش نظر آتے ہیں -

غالب : وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

یعقوب بٹ : (آستیں چڑھاتے ہوئے) مرزا صاحب اس شاعری سے کچھ حاصل بھی ہوا یا یونہی عمر گنوائی - اس کی بجائے رہڑی لگاتے تو مقروض تو نہ ہوتے -

غالب : کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

مجتبیٰ احمد : مجھے معلوم ہے مرزا صاحب بار بار میرے نئے بشرٹ کو دیکھ رہے ہیں ، آپ کو پسند ہے تو نیا سلوا دوں - ویسے آپ کس قسم کے کپڑے کو پسند کرتے ہیں ؟

غالب : جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

ممتاز حسین : مرزا صاحب آپ نے تاریخ تیموریہ لکھنی شروع کی تھی - اس کا کیا بنا ! میں آج کل مغل پریڈ پڑھا رہا ہوں - اگر اجازت دیں تو مغلوں کے زوال کے اسباب پر ابھی لیکچر ----

غالب : صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

نثار احمد : دراصل بات لباس کی ہو رہی تھی - مرزا صاحب آپ نے لباس کے بارے میں بھی تو کچھ کہا تھا -

غالب : ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

اے .بی صدیقی : کیا آپ کے یہاں مرغابی کا شکار مل جاتا ہے - اتوار مشکل سے گزرتا ہے -

غالب : صید زدام جستہ ہے اس دام گاہ کا

سعداللہ خاں : مرزا صاحب ! آپ کو ٹریسی نیشن کے احکام تو نہیں ملے ؟

غالب : لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

فیض محمد : تھوڑی دیر کے لیے فوٹو گرافک کلب میں بھی تشریف لائیے گا - سنا ہے آپ نے فوٹو گرافی کی دکان کھول رکھی تھی -

غالب : سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

محمد صدیق : مرزا صاحب ! آپ نے اپنے پیچھے بہت سی یادگاریں چھوڑی ہوں گی - اگر لائبریری کے لیے کچھ مل جائے تو نوازش ہوگی -

غالب : چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط

تجمل حسین : (سگریٹ سلگاتے ہوئے) میں سب باتیں سن رہا ہوں - لیکن یاد رکھیے مرزا صاحب کو یونین فنڈ سے ٹی - اے ، ڈی - اے نہیں مل سکتا -

مظہر علی : بالکل صحیح ہے ''کانٹی جینٹی'' سے بھی کوئی رقم نہیں ملے گی -

عبدالرحمن : آپ نے ہماری زیر تعمیر مسجد بھی دیکھی ہے یا نہیں - چندہ دے سکیں تو عنایت ہوگی - آج جمعہ کی نماز یہیں پڑھیے گا -

غالب : جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

پرنسپل : ہمیں کالج کے لیے موٹو چاہیے کیا آپ کرم فرمائیں گے -

غالب : روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

مِیال : اپنا ایڈریس بھی دے جائیں تاکہ بعد میں خط و کتابت ہو سکے -

غالب : ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

پرنسپل : (شربت کا گلاس پیش کرتے ہوئے) لیجیے نوش فرمائیے -

غالب : (مسکرا کر) ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

پرنسپل : مرزا صاحب ! ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں کہ آپ نے ہماری درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور اتنی سخت گرمی میں یہاں تشریف لائے - امید ہے آپ آئندہ بھی ہمیں فیض یاب کرتے رہیں گے -

حضرات ! آج کا پروگرام ختم ہوا -

اس کے بعد مرزا صاحب اٹھ کھڑے ہوئے - سجاد اختر انہیں اپنی کار میں بٹھا کر نہ جانے کہاں لے گئے سب لوگ گھروں کو جانے لگے - خلیل صاحب اپنے موٹر سائیکل کی طرف بڑھے - عباسی صاحب نے دھکا لگایا اور جونہی سٹارٹ ہوا میری آنکھ کھل گئی اور جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا -

زاهد کاشمیری

اندیشہ ہائے دور دراز

مرزا صاحب نے ہمارے اساتذہ کرام کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے - کیا آپ بتا سکتے ہیں کس کس کے متعلق کیا کہا ہے -

۱ - بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

۲ - آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل

۳ - نہاد من عجمی و طریق من عربی است

۴ - اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

۵ - نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

۶ - ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

۷ - آزمائش جال سے فارغ نہیں ہنوز

۸ - سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری

۹ - ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے

۱۰ - اڑنے سے پیشتر ہی میرا رنگ زرد تھا

۱۱ - بنا ہے عیش ---- کے لیے

۱۲ - نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ

۱۳ - پارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ

۱۴ - گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

۱۵ - بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے

۱٦ - رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

۱۷ - جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم

۱۸ - ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

۱۹ - ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

۲۰ - یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی

۲۱ - جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

۲۲ - کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

نوٹ ! جن کو اپنی شخصیت کا پرتو نظر نہ آئے وہ مدیر کارواں سے رابطہ قائم کریں ۔ کچھ ان کے پاس محفوظ ہیں ۔

ڈرامیٹک کلب

مجھے کیا بُرا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا

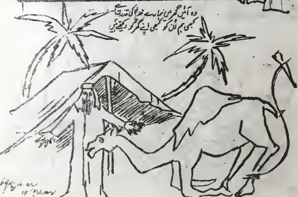
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

حوالات
قرض کی پیتے تھے مے سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
Mazhar

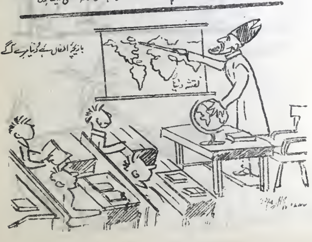
بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
نقشہ دنیا

آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا، غالبؔ!
کس کے گھر جائے گا، سیلابِ بلا، میرے بعد

بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم، کوئی ہمیں اُٹھائے کیوں؟

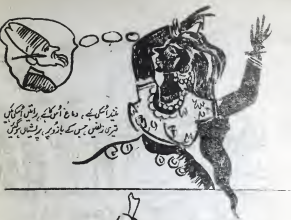
نیند اُسکی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر، پریشاں ہوگئیں

ہوتاہے شب و روز تماشہ مرے آگے

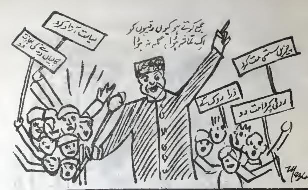
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشہ ہوا، گلہ نہ ہوا
سیاست آزاد کرو
گالیاں دینے کی اجازت دو
چیزیں سستی مت کرو

گو میں رہا رہین ستمہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

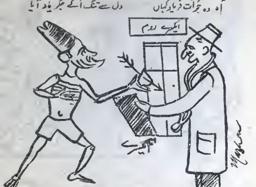

آہ وہ جرأت فریاد کہاں
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا
ایکسرے روم
ایکسرے

GHALIB
درد دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلادوں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

سب لکیریں ہاتھ کی، گویا رگِ جاں ہو گئیں

یاد تھیں جتنی دعائیں، صرفِ درباں ہو گئیں

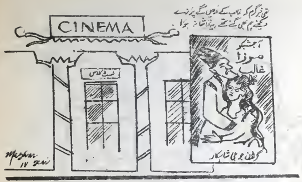
تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا
CINEMA
فسٹ کلاس
آج شب کو
مرزا
غالب

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

THE CARAVAN

GHALIB NUMBER

GOVERNMENT COLLEGE, JHANG